سفرنامہ
چلو جاپان چلتے ہیں
امجد اسلام امجد

چلو جاپان چلتے ہیں

چند دن قبل جب نوجوان شاعر عامر بن علی کا ٹوکیو سے فون آیا کہ وہاں کی تین یونیورسٹیاں (جن میں اردو پڑھائی جاتی ہے) اور پاکستان جاپان حلقہ ادب وثقافت مل کر کچھ تقریبات کا اہتمام کر رہے ہیں جن میں مجھے بھی آنا ہوگا تو میرا پہلا ردعمل سراسر حیرت پر مبنی تھا کیونکہ دو چار کو چھوڑ کر میرے سارے غیر ملکی سفر مشاعروں کے حوالے سے ہی ہوئے ہیں اور اگرچہ جاپانی حضرات بات بات پر فرشی سلام کے انداز میں بار بار جھکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان سے ''مطلع عرض ہے'' اور ''مکرر ارشاد'' سننے کی دور دور تک توقع نہیں تھی۔

یوں بھی فی الوقت میں امریکہ' کینیڈا' ناروے اور بھارت کی مختلف دعوتوں سے معذرت کی کارروائیوں میں الجھا ہوا تھا کہ تدریس سے انتظامی عہدوں پر آنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ موسم گرما کی چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں جن میں طویل مدت کے لیے بیرون ملک سفر کرنے کی گنجائش نکل آتی تھی۔ میں نے عامر بن علی کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو اس نے یہ کہہ کر بات ہنسی میں ٹال دی کہ آنے جانے کے وقت سمیت سارا پروگرام سات دن پر مشتمل ہے اور جاپان یقیناً اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔

گزشتہ برسوں میں ہمارے تین نزدیکی احباب جاپان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دے چکے ہیں یعنی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سہیل احمد خان ۔۔۔۔۔۔ اور تینوں ہی کی زبان سے میں نے جاپان کے بارے میں ہمیشہ کلمہ خیر ہی سنا تھا۔ یوں بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان کی صنعتی ترقی کی رفتار' اس کا والیوم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اس کی جادوگریاں ایسی ہیں کہ بے اختیار دل اس ملک اور اس کے لوگوں کو ان کے گھر میں دیکھنے کو چاہتا ہے کہ یہ قوم آج کی دنیا میں ایک زندہ معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔

معلوم ہوا کہ شروع میں صرف مجھے اور عطاء الحق قاسمی کو بلانے کا پروگرام تھا مگر اب محمود شام اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی ہمارے ساتھ ہم سفر ہوں گے تاکہ شاعری' طنز و مزاح' صحافت اور اقبالیات چاروں شعبوں کا احاطہ کیا جاسکے۔ فارن آفس کے جاپان ڈیسک سے متعلق افسران اسد گیلانی اور آفتاب احمد کی خصوصی دلچسپی اور کوشش سے ویزوں کے حصول کا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہوگیا اور طے پایا کہ ۹ جون کو ہم سب ٹوکیو کے لیے براستہ بنکاک روانہ ہوں گے لیکن اس دوران میں ایک واقعہ یہاں اور ایک وہاں رونما ہوا یعنی ہمارے گروپ میں سے رفیع الدین ہاشمی علالت کی وجہ سے ڈراپ ہوگئے اور دوسری طرف جاپان کی وزارت خارجہ نے ہم لوگوں کو مزید ایک ہفتے کے لیے اپنا مہمان بنانے کا پرجوش ارادہ ظاہر کیا۔ ایسی اچھی دعوت سے انکار کرنا یقیناً کفران نعمت سے کم نہیں۔ لیکن صورت حال کچھ ایسی ہے

کہ ہم تینوں ہی اپنی اپنی مختلف وجوہات کے باعث اتنا عرصہ وہاں نہیں رک سکتے۔ سو تادم تحریر اس بات پر سوچ بچار ہو رہا ہے کہ کس طرح اس معاملے کو سات سے چودہ دن تک بڑھانے کی بجائے نو یا دس دن میں اس طرح سمیٹا جائے کہ طے شدہ پروگرام کے بعد کچھ دن وزارت خارجہ کے لیے بھی نکل آئیں۔ بہرحال جو بھی فیصلہ ہوا آپ کو اس کی اطلاع آئندہ کسی کالم میں مل جائے گی کہ میرا ارادہ اس سفر کے تاثرات کو ساتھ ساتھ قلم بند کرنے کا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ سفرناموں کے اس جمعہ بازاری دور میں بھی جاپان کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ جو تحریریں حافظے میں موجود ہیں ان میں قابل ذکر نام ابن انشاء' اختر ریاض الدین' حکیم محمد سعید اور ہمارے گریز پا مجوزہ ہم سفر رفیع الدین شاہ ہاشمی کے ہی ہیں۔ جاپانیوں کی عقل مندی اور دور اندیشی کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی زمانے میں ہی اپنی یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کی تعلیم کے شعبے قائم کر دیے تھے جو آئندہ چل کر ان کی مصنوعات کی منڈیاں بننے والے تھے۔ تین یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کا اہتمام بھی اسی پروگرام کا حصہ ہے۔

چینیوں کی طرح جاپانیوں کے نام بھی آپس میں اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ زیر زبر پیش یا کسی حرف پر زور دینے سے بظاہر ایک جیسے نظر آنے والے نام کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ سو ہوا یوں کہ میں نے عامر بن علی کے ہاتھ غلام عباس پر پی ایچ ڈی کرنے والے جاپانی دوست سویمانے کو اپنی ایک کتاب بھجوائی اور سنگ میل پبلی کیشنز کے برادرم افضال احمد سے اس کا موجودہ ٹیلی فون نمبر حاصل کیا تا کہ عامر اس سے فون پر رابطہ کر کے اس کا وہ پتہ حاصل کرے جس پر کتاب اسے مل جائے سب کچھ اسی طرح ہوا مگر وہ کتاب کسی اور سویمانے کو پہنچ گئی جو اردو کی شد بد تو رکھتا تھا لیکن اس کا شعبہ عمرانیات ہے جس کے سلسلے میں وہ پاکستان آتا رہتا ہے اور غالباً افضال نے غلطی سے مجھے اس کا فون نمبر دے دیا تھا۔

جاپان کی مہنگائی' خوبصورتی اور ترقی کے قصے وہ لوگ بھی انتہائی اعتماد سے سناتے ہیں جنہوں نے آج تک جاپان کی سرزمین پر قدم بھی نہیں رکھا۔ اب یہ کام ٹی وی' انٹرنیٹ یا دنیا کے گلوبل ولیج کی شکل میں سکڑنے' نے دکھایا ہے یا اس سنی سنائی کا شاخسانہ ہے جس سے ہم افواہ کو حقیقت کا رنگ دے دیتے ہیں اس کا جواب تو میں آپ کو ''سفید گھوڑا'' دیکھ کر ہی دے سکوں گا۔

جن قارئین کو سفید گھوڑے کے پس منظر سے آگاہی نہیں ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک بزرگوار اپنے پوتے کے ساتھ ایک سینما کے سامنے سے گزر رہے تھے جہاں تماشائیوں کا ہجوم تھا اور ٹکٹیں بلیک ہو رہی تھیں۔ دادا کے استفسار پر پوتے نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے بتایا کہ اس فلم میں ہیروئین بغیر کوئی کپڑا پہنے ایک سفید گھوڑے پر سواری کرتی دکھائی گئی ہے اور اسی سین کی وجہ سے یہ فلم اتنا رش لے رہی ہے۔

بزرگوار نے چند لمحے تفکر کیا' پھر بولے۔
''آؤ ہم بھی یہ فلم دیکھتے ہیں کیونکہ میں نے بہت دنوں سے کوئی سفید گھوڑا نہیں دیکھا۔''
سو ہم بھی جاپان چلتے ہیں کیونکہ ایک دوست کے بقول ہمیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ جاپان میں گھوڑتے ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔

ٹوکیو براستہ بنکاک

۹ اور ۱۰ جون کی درمیانی رات کو تھائی ائیر کی فلائیٹ نمبر T.G.506 میں سوار ہوتے وقت مجھے اپنا شاعر دوست فیصل عجمی بہت یاد آیا کہ تقریباً چودہ برس قبل میں نے بنکاک کا پہلا سفر اسی کی دعوت پر کیا تھا۔ فیصل گزشتہ دو سال سے نامعلوم وجوہات کی بنا پر سین سے غائب ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کی عمدہ شاعری' رسالہ ''آثار'' اور ادب اور ادیبوں کے سلسلے میں کئے گئے بہت سے اچھے کاموں کو بھول کر اس کے سین سے غائب ہونے کی ایسی ایسی تاویلیں کرتے رہتے ہیں جن کی بنیاد صرف اور صرف افواہوں پر ہے۔ میں اس کے کاروباری معاملات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ادب اور ادیبوں کی حد تک اس نے کچھ نہ کچھ دیا ہی ہے' لیا نہیں۔

اس بات کا میرے موجودہ دورۂ جاپان سے اگرچہ کوئی براہ راست تعلق نہیں لیکن چونکہ میں اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا سو آج کر دیا کہ کسی کی اچھائی کی تعریف نہ کرنا اور بہتان تراشی ہمارے معاشرے کا عمومی مزاج بنتی جا رہی ہے جو یقیناً کوئی مثبت رویہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں آپ کو گزشتہ کالم میں بتا چکا ہوں۔ یہ تین رکنی ادبی دورہ پاکستان جاپان دوستی کی تنظیم کے شعبہ اردو وثقافت کی طرف سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں مشاعروں کے ساتھ جاپان کی تین ایسی یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ سے ملاقاتیں شامل ہیں جہاں اردو زبان بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے۔

لاہور سے بنکاک تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کی فلائیٹ ہے اس میں ٹائم ڈفرنس کے دو گھنٹے شامل کر کے میں اور عطاء الحق قاسمی بنکاک کے وقت کے مطابق صبح ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچے۔ ہمارے تیسرے ساتھی مشہور صحافی اور شاعر محمود شام ہیں جو گزشتہ شام ہم سے پہلے کراچی سے بنکاک پہنچ چکے ہیں۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جس وقت جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کیا' عطاء الحق قاسمی تھائی لینڈ میں پاکستان کے سفیر کے طور پر نیا نیا آیا تھا اس نے بتایا کہ اس نے ان دنوں پاکستان سے کچھ شاعروں کو مدعو کر کے ایک عدد مشاعرے کا اہتمام کیا تھا اور صورت حال یہ تھی کہ مہمان اور میزبان دونوں کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کا مستقبل کیا ہے۔

بنکاک ائیر پورٹ پر ہمیں تقریباً پانچ گھنٹے رکنا تھا۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں اس وقت زیادہ تعداد پاکستانی اور ہندوستانی مسافروں کی تھی۔ شاید اسی وجہ سے ٹرانزٹ لاؤنج جمعہ بازار کا منظر پیش کر رہا تھا اور وہ لوگ بھی ٹرانسفر ڈیسکوں کے سامنے جمگھٹا سا لگائے ایک دوسرے سے

آگے نکلنے کی کوششیں کر رہے تھے جن کی فلائٹوں میں ابھی کئی گھنٹوں کا وقت تھا۔ عطاء نے دو تین لوگوں کو روک کر اس جگہ کا پتہ معلوم کیا جہاں سگریٹ پینے کی اجازت تھی۔ معلوم ہوا کہ مقامی انتظامیہ نے اس کے لیے کچھ کیبن بنا رکھے تھے جن میں بیٹھ کر لوگ ایسے خضوع و خشوع سے سگریٹ پیتے ہیں جیسے کوئی عبادت کر رہے ہوں۔

عزیزی عامر بن علی نے فون پر بتایا کہ بنکاک ائیر پورٹ پر آپ کو بہت اچھے مساج پارلرز مل جائیں گے جہاں بہت شریفانہ فضا اور ماہرانہ انداز میں مسافروں کی تھکن دور کی جاتی ہے۔ ہمیں گیٹ نمبر گیارہ سے اپنے جہاز پر سوار ہونا تھا اسی کے راستے میں مساج پارلر تھا۔ مختلف مساجوں کی نوعیت اور ان کی فیس انگریزی اور تھائی دونوں زبانوں میں درج تھی۔ کندھوں اور پاؤں کے ۴۵ منٹ کے مساج کا ریٹ ۵۰۰ مقامی باتھ یعنی ۱۵ امریکی ڈالر تھے جو یقیناً برا سودا نہیں تھا کہ رات کے جگراتے اور فلائیٹ کی تھکن دونوں کا احساس ختم ہو گیا۔ گزشتہ چند برسوں سے شوگر کی وجہ سے میرے پاؤں کی انگلیاں جزوی پر سن رہتی ہیں وقتی طور پر ہی سہی' لیکن یوں لگا جیسے پاؤں کی سوئی ہوئی رگوں میں زندگی جاگ پڑی ہو۔ چنانچہ ہم دونوں نے دوران مساج ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ واپسی پر پھر اسی تجربے کو دوہرائیں گے۔

فلائیٹ کا کھانا اس بار پہلے سے بھی بدمزہ تھا۔ میں طبعاً گوشت خور نہیں ہوں اور مچھلی بھی نہیں کھاتا اور سفر میں مجھے اکثر اس باب میں پریشانی رہتی ہے سو میں نے بن اور کافی پر اکتفا کیا اور سونے کی کوشش کی کیونکہ سامنے سکرین پر چلنے والی فلم بھی انتہائی بور تھی۔ جہاز خاصا بڑا اور نیا نیا تھا البتہ ائیر ہوسٹسوں کا انتخاب بقول عطا اس احتیاط سے کیا گیا تھا کہ اہل ایمان کو کسی امتحان سے نہ گزرنا پڑے۔ جاپانی وقت کے مطابق ہم مقررہ وقت سے پانچ منٹ قبل ٹوکیو پہنچ گئے۔ امیگریشن کے پندرہ بیس کاؤنٹرز میں سے صرف ایک آباد تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے بڑے اور مصروف ہوائی اڈے پر ''کوئی ویرانی سی ویرانی ہے'' کا سیٹ کیوں لگایا گیا تھا۔ اتفاق سے ہم لائن کے ابتدائی حصے میں تھے سو جلدی ہی باری آ گئی ہم سے پہلے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی آفیسر نے مسافر کلیئر کرنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی لیکن ہمارا پاسپورٹ شاید اسے زیادہ پسند آ گیا تھا۔ کیونکہ وہ بار بار کبھی ہمیں کبھی پاسپورٹ کو اور کبھی کمپیوٹر کی سکرین کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسی اثناء میں اس کے ساتھ والے کاؤنٹر پر ایک چپلا دبلا سا لڑکا بیٹھ چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جاپانی میں کچھ کہا اور پھر ہمارے بھرے ہوئے امیگریشن فارم کا جائزہ لینے لگی اچانک کسی طرف سے ایک نسبتاً دراز قد اور خوش شکل سی لڑکی نمودار ہوئی۔ دونوں نے ہمارے پاسپورٹ اس کے حوالے کئے اس سارے عمل کے دوران تینوں کے چہروں کی مسکراہٹ میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔

نووارد حسینہ نے جو اپنی وردی سے کوئی سینئر افسر لگ رہی تھی ہمیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی بائیں طرف واقع ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور پہلے سے بھی زیادہ دوستانہ مسکراہٹ سے گویا ہوئی کہ آپ لوگ یہاں کس مقصد سے تشریف لائے ہیں اور یہ کہ آپ کے میزبان کون ہیں اور آپ کو کہاں ٹھہرائیں گے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جاپانی لوگ اساتذہ اور پروفیسرز کی بہت عزت

کرتے ہیں چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ ہم لوگ پروفیسر ہیں اور تین جاپانی یونیورسٹیوں کی مشترکہ دعوت پر آئے ہیں اور متعلقہ دعوت نامہ ہمارے سامان میں موجود ہے اور پوچھا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ اس پر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی اور اس نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں' آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے دونوں پاسپورٹ ایک مخصوص لفافے میں ڈالے اور ایک تیسرے دروازے سے باہر نکل گئی اس دوران میں چھ سات خواتین وحضرات جو صورت سے لاطینی امریکہ کے باشندے لگتے تھے کچھ گھبرائے گھبرائے سے کمرے میں داخل ہوئے اور ہمارے اردگرد بیٹھ گئے ان کی خاموشی اور پریشانی طرح طرح کے اندیشوں کو جنم دے رہی تھی تقریباً پانچ منٹ بعد (جو اس وقت پانچ گھنٹوں سے بھی طویل لگے) وہ اسی انتہائی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک اور دروازے سے اندر آئی اور انگریزی سے ملتی جلتی ایک زبان میں ہم سے معذرت کی کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا اور پاسپورٹ ہمارے حوالے کردیئے اور ہمیں اس پوائنٹ تک چھوڑنے آئی جہاں سے ہم اپنا سامان لینے کے لیے متعلقہ ہال میں داخل ہوسکتے تھے ایسی ٹینشن بھری صورت حال کا یہ انجام سکون بخش ہونے کے باوجود اتنا غیر متوقع تھا کہ کتنی دیر تک ہم یہی سوچتے رہے کہ یہ قوم کیسی انسان دوست اور تہذیب یافتہ ہے۔ باہر نکلے تو عزیز عامر بن علی اور اس کے بڑے بھائی عابد حسین سراپا انتظار کھڑے تھے۔ ہم نے انہیں تاخیر کی وجہ اور امیگریشن افسران کی خوش اخلاقی کی روداد سنائی تو دونوں یک زبان ہوکر بولے کہ عاجزی' انکساری اور خوش اخلاقی میں جاپانی قوم کا مقابلہ صرف جاپانی قوم ہی کرسکتی ہے۔

ٹوکیو میں پہلی شام

جب ایئرپورٹ سے نکلے آدھا گھنٹہ ہوگیا تو باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ ٹوکیو شہر ابھی مزید آدھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور دور دور تک پھیلا ہوا ہے کہ اس میں کئی ''ضمنی'' شہر بھی اس طرح شامل ہیں کہ من تو شدم تو من شدی کا سا معاملہ ہے اور یہ کہ فی الوقت ہم کچھ دوستوں کی فرمائش پر ایک مسجد میں جارہے ہیں جہاں قرآن وحدیث کی تعلیم کا بھی اہتمام ہے۔ ''مسجد حرا'' کے نام سے یہ چھوٹی سی مسجد ایک تین منزلہ عمارت میں قائم تھی اور ہر منزل پر ایک ہی کمرہ تھا جس میں چالیس پچاس آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ گراؤنڈ فلور پر خواتین کے لیے نماز کا انتظام تھا اور باقی دو منزلوں پر مرد حضرات یہ فرض ادا کرتے تھے۔ دراصل یہ ایک رہائشی عمارت تھی جس کی چھت پر دو چھوٹے چھوٹے مینار تعمیر کرکے اسے مسجد کی شکل دے دی گئی تھی۔

جس وقت ہم وہاں پہنچے نماز ختم ہونے کے قریب تھی۔ ہمارے میزبان پاکستان جاپان ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری ملک حبیب الرحمٰن ہمارے منتظر کھڑے تھے۔ ان کی عمر تو لگ بھگ ۶۴ سال تھی لیکن آواز سے وہ ۸۰ برس کے لگتے تھے۔ یہ بات اس لیے بھی حیرت انگیز تھی کہ طبیعت کے اعتبار سے وہ بہت خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے اور عام طور پر ایسے لوگوں کی آواز ان کی عمر کی نسبت زیادہ جوان

ہوتی ہے۔

نشست کا انتظام دوسری منزل پر تھا' ایک اعتبار سے اچھا لگا کہ ہمارے دورے کا آغاز ایک بابرکت جگہ سے ہو رہا تھا۔ لیکن مذہبی معاملات کے بارے میں وہاں پر موجود احباب کا عمومی رویہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھا کہ ایسی ترقی یافتہ اور سماجی اعتبار سے مستحکم سوسائٹی میں رہنے کے باوجود ان کا رجحان ''معاملات'' کی بجائے ''عبادات'' کی طرف زیادہ تھا اگرچہ یہ ہمارا قومی مزاج ہے کہ ہم نیکیاں کمانے کے بجائے انہیں گننے پر زیادہ زور دیتے ہیں اور یوں ہمارا اللہ سے تعلق بندگی سے زیادہ ''کاروبار'' کا سا رہتا ہے لیکن یہ بات بہرحال خوش آئند تھی کہ اتنی مختصر اور جاپان بھر میں منتشر کمیونٹی ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنے قومی اور مذہبی تشخص کو قائم رکھنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ پورے جاپان میں رجسٹرڈ پاکستانیوں کی تعداد صرف ۸۶۰۰ ہے۔

تلاوت کلام پاک' درس حدیث اور ہم تینوں مہمانوں کے اظہار خیال کے بعد سوال و جواب کی ایک مختصر نشست ہوئی جس کے دوران معلوم ہوا کہ وہاں کی حکومت اور عوام کسی کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیتے اور لوگ اپنے اپنے اعتقادات کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہیں۔ اس کے بعد روایتی لنگر کا کھانا ہوا جو نان اور قورمے پر مشتمل تھا مگر بہت پر لطف اور ذائقے دار تھا جس کی ایک وجہ ہماری بھوک کی شدت اور جہاز کے کھانوں کی بدمزگی بھی ہو سکتی ہے' لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔

ہمارا ہوٹل Mitsul Garden کھاتا کے علاقے میں تھا جو ڈاؤن ٹاؤن یعنی پرانے شہر میں واقع ہے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے ہوٹل کے اردگرد بہت سے نائٹ کلب ہیں اور یوں اسے ''بازار حسن'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے منتظمین کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا کہ ہمارے کردار کے بارے میں ایسی غلط اور منفی رپورٹ انہوں نے کہاں سے حاصل کی تھی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ہماری تشفی کر دی کہ ان کی ایسوسی ایشن کا دفتر ہوٹل سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر ہے اور اس جگہ کا انتخاب انتظامی سہولتوں کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

میرے حصے میں کمرہ نمبر ۹۱۱ آیا جو اب نائن الیون کے حوالے سے ایک جداگانہ معانی کا حامل بن چکا ہے اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک بار ڈیرہ غازی خان میں مجھے اور انور مسعود کو جو کمرہ ملا تھا اس کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ اسی کمرے سے ایمل کانسی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ کمرہ معقول درجے کے تمام رہائشی تقاضوں کو پورا کرتا تھا لیکن اس کے باوجود اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے اپنے درمیانے درجے کا اٹیچی کیس رکھنے کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑی کہ بیگ رکھنے کے بعد کمرے میں کھڑے ہونے کے لیے جگہ پیدا کرنا بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔ اس وقت مجھے شفیق الرحمٰن کا بلبل کے بارے میں لکھا ہوا ایک جملہ بہت یاد آیا۔ اپنے ایک مضمون ''ملکی پرندے و دیگر جانور'' میں وہ کہتے ہیں۔

''بلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے یعنی اگر پر نکال دیئے جائیں تو کچھ زیادہ بلبل باقی نہیں بچتی۔''

حکومت پاکستان کے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ وہ پٹرول کی ہوشربا گرانی کے جواب میں جاپان کی مثال بھی دے سکتی ہے جہاں

پٹرول پاکستانی کرنسی کے مطابق ۶۸ روپے فی لٹر ہے بس اتنی احتیاط کرنا ہوگی کہ عوام کو جاپانیوں کی فی کس سالانہ آمدنی کا پتہ نہ چلنے پائے۔ ہوٹل کے عملے کی انگریزی اس قدر کمزور تھی کہ ہم سب ان کے مقابلے میں ''اہل زبان'' لگ رہے تھے۔ اس قدر امریکی اثر کے باوجود جاپانیوں کی انگریزی زبان سے یہ بے اعتنائی سمجھ سے باہر تھی۔ یہ مسئلہ کسی حد تک عزیزی مظہر دانش نے حل کیا۔ لیجئے' یہ تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا کہ مظہر دانش سے ہماری ملاقات ہوٹل کے لاؤنج میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ بہت دیر سے ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا اس سے ٹیلی فون پر رابطہ تو گزشتہ ایک ماہ میں کئی بار ہوا کہ ہماری آمد کے انتظامات وہ اور عامر بن علی مل کر کر رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ چند برس قبل پنجاب یونیورسٹی کے رسالہ ''محور'' کے حوالے سے مجھ سے انٹرویو لے چکا ہے۔ دانش کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں گی کہ یہ نوجوان اس کے بعد ہماری جاپان سے ''رخصتی'' تک ہر جگہ ہمارے ساتھ رہا اور اس کی محبت' عقیدت اور گرم جوشی نے ہمیں سارے سفر میں شاد اور سرشار رکھا۔ اس نے بتایا کہ جب امریکی فوجوں نے جاپان پر قبضہ کر لیا تو بادشاہ نے جو واحد فرمائش ان سے کی وہ یہی تھی کہ اور جو چاہو کر لو مگر ہم سے ہماری زبان نہ چھیننا۔ سو آج بھی جاپان میں ذریعہ تعلیم ان کی اپنی زبان ہے اور ان کا ایک محدود اور متعلقہ طبقہ ہی انگریزی زبان سیکھتا ہے مگر صرف ''کام چلاؤ'' حد تک ۔۔۔۔۔۔ ہماری طرح نہیں کہ جہاں پڑھے لکھے ہونے کی واحد نشانی صرف اور صرف انگریزی ہے اور بقول مشتاق احمد یوسفی' ہمارے بیوروکریٹ صحیح اردو پر غلط انگریزی کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ ہماری نئی انگلش میڈیم نسل تو چھینکتی بھی انگریزی میں ہے اس کے نزدیک ''آؤچ'' کے بعد ''الحمد للہ'' کے بجائے ''ایکسکیوزمی'' کہنا چاہیے کہ ایسی معذرت طلب بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا بڑی جہالت کی بات ہے۔

معلوم ہوا کہ برادرم ڈاکٹر فخر الحق نوری جو آج کل اوسا کا یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں' پہنچ چکے ہیں اور اس وقت اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ نوری گزشتہ کئی برسوں سے میری اور عطاء کی مادر علمی اورینٹل کالج میں پڑھا رہے تھے اور اب تقریباً ایک برس سے برادرم ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی خالی کی ہوئی جگہ پر کام کر رہے ہیں اگرچہ پاکستانی یونیورسٹیوں سے کئی ایک اساتذہ نے جاپان کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے ہیں مگر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی وابستگی کا دورانیہ کم و بیش ۲۴ برس پر محیط ہے جو اپنی جگہ پر ایک ریکارڈ ہے۔

ملک حبیب الرحمٰن اپنی تھکی ہوئی آواز میں فر فر جاپانی بول کر ہمارے ہوٹل میں چیک ان ہونے کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ باہر سڑک پر ہلکی ہلکی بارش میں اکا دکا مرد و زن چھتریاں لیے جیسے نیند میں چل رہے تھے (ممکن ہے وہ ٹھیک ہی چل رہے ہوں اور نیند ہماری آنکھوں میں ہو کہ رات کے دو بج رہے تھے) ایک بزرگ صورت جاپانی ہوٹل کے صدر دروازے پر آیا اس نے چھتری بند کی اور دروازے پر رکھے ایک سٹینڈ میں سے ایک پلاسٹک کا کور اتار کر اس پر لپیٹا اور کورنش بجالانے کے مخصوص جاپانی انداز میں ہمارے قریب

سے بار بار جھکتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ جاپان میں بارشیں چونکہ بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لیے چھتریوں کے لیے پلاسٹک کورز دروازوں پر رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ پانی باہر نہ گرے بعد میں پتہ چلا کہ جاپانی اپنے آنسو بھی باہر نہیں گرنے دیتے۔

ٹوکیو میں مشاعرہ

۱۱ جون ۲۰۰۶ء اس اعتبار سے ایک تاریخی دن ہے کہ اس روز جاپان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا اردو مشاعرہ ہوا جس میں بیک وقت چار صاحب دیوان شاعروں نے شرکت کی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پاکستان جاپان ایسوسی ایشن نے اتوار کے دن گیارہ بجے صبح ہماری قیام گاہ یعنی Mitsul Garden ہوٹل ہی کے ایک ہال میں مذاکرے اور مشاعرے کا اہتمام کر رکھا تھا میں نے صبح دس بجے استقبالیہ پر فون کر کے پوچھا کہ ناشتے کی کیا پوزیشن ہے تو جواب ملا کہ ہم ساڑھے نو بجے کے بعد کمروں سے ناشتے کا آرڈر نہیں لیتے اور بوفے کا ہمارے یہاں رواج نہیں۔ میں نے پوچھا' ریستوران تو کھلا ہوگا ہم لوگ نیچے آ کر ناشتہ کر لیتے ہیں۔ اس پر دوسری طرف کی انگریزی ختم ہوگئی اور کچھ اس قسم کے الفاظ کہے گئے جن سے یہ مفہوم نکالا جا سکتا تھا کہ میں ابھی پتہ کر کے بتاتی ہوں۔

پانچ چھ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ایک خوش قامت اور قدرے سینئر دکھائی دینے والے ہوٹل کے نمائندے نے اپنی شکستہ تر انگریزی میں دریافت کیا کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے صرف دو ٹوسٹ' دو انڈوں کا آملیٹ اور ایک عدد چائے کا کپ چاہیے۔ اس شریف آدمی نے تینوں فرمائشوں کے جواب میں نفی میں سر ہلایا اور جو کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ ہم ایسی خرافات میں یقین نہیں رکھتے اگر تم چاہو تو میں تمہیں ٹونا مچھلی کا سینڈوچ یا مچھلی کے شوربے میں بنی ہوئی نوڈلز بازار سے لا کر دے سکتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سی فوڈ نہیں کھاتا اور یہاں کے چکن کے سلسلے میں میرے کچھ تحفظات ہیں اس لیے تم اگر آملیٹ اور ٹوسٹ نہیں لا سکتے تو مجھے سبزی کا سینڈوچ لا دو۔ اس نے بھی جاپانیوں کا مخصوص جواب دیا کہ میں پتہ کر کے بتاتا ہوں اور مسکرا کر دو تین بار کورنش بجا لانے کے بعد چلا گیا لیکن اس کی آنکھوں میں موجود مخمصہ بتا رہا تھا کہ اسے میری بات سمجھ نہیں آئی۔

دو منٹ بعد پھر دستک ہوئی' دروازہ کھولا تو سامنے ایک چھ فٹے' قوی ہیکل' خوش شکل اور خوش لباس درمیانی عمر کے شخص کو موجود پایا جس کی مسکراہٹ اس کے پورے وجود سے امڈی پڑ رہی تھی اچانک اس کی آڑ سے ملک حبیب الرحمٰن ظاہر ہوئے اور بتایا کہ موصوف پاکستان جاپان ایسوسی ایشن کے صدر امتیاز احمد گوندل ہیں۔ مصافحے اور معانقے کے مراحل سے گزرنے کے دوران ہی پتہ چل گیا کہ امتیاز گوندل ایک بہت محبت کرنے والا اور گرم جوش انسان ہے جب اسے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تو اس کی پریشانی دیدنی تھی۔ ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر اور مہمان نواز انسان کی طرح اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ ہمیں ہوٹل والوں سے مذاکرات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے اور کسی قریبی ریستوران میں چل کر پیٹ پوجا کرنی چاہیے۔ عطا اور محمود شام کو فون پر اطلاع دی گئی کہ وہ جلدی سے ہوٹل کی لابی میں آ جائیں

کیونکہ تقریب کے آغاز میں وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔

کمرے سے نکلنے اور تالہ لگانے کے دوران ابھی امتیاز گوندل صرف یہی بتا پایا تھا کہ اس کا تعلق منڈی بہاؤالدین سے ہے کہ وہی افسر نما ویٹر ہاتھ میں ایک لفافہ سا لیے پھر آ پہنچا۔ اب چونکہ میرے ساتھ جاپانی بولنے والے دو ساتھی تھے اس لیے گفتگو آسان ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ موصوف ٹونا فش کے بجائے کسی اور مچھلی کا سینڈوچ لے آئے ہیں جس کے ساتھ تازہ سبزی کا سلاد بھی ہے۔ میں نے اپنے سمجھانے اور اس کے سمجھنے پر آفرین کہی تو اس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی۔

Johnathans نامی ریستوران کا سلسلہ وہاں میکڈونلڈ کے ایف سی اور پیزا ہٹ سے زیادہ مقبول نظر آیا۔ ٹوکیو میں ایک دوسری چین Joy Full کے ریستوران بھی جگہ جگہ نظر آئے۔ امتیاز گوندل کے ساتھ ٹویاما شہر سے ملک ممتاز، زبیر اور مالک بھی آئے تھے کہ آج کی رات اور کل کا دن ہمیں ان کا مہمان ہونا تھا۔ یہ سب لوگ ہی بہت محبت کرنے والے تھے۔ ممتاز سرگودھا اور زبیر فیصل آباد کا رہنے والا ہے اور دونوں کی حس مزاح بہت تیز ہے۔ چنانچہ انہوں نے دو چار ملاقاتوں کا تکلف بھی نہیں کیا اور پہلی ملاقات میں ہی اس قدر کھل گئے کہ دس پندرہ منٹ بعد ہی مہمان اور میزبان میں تفریق کرنا مشکل ہوگیا۔

زیادہ تر یہی موضوع زیر بحث رہا کہ پردیس میں غیر مانوس خوراک، ذائقے اور حلال حرام اور ذبیحے کے مسائل کا کیا حل نکالا جائے۔ آخری نتیجہ یہی نکلا کہ آدمی غیر مانوس خوراک اور ذائقے کا تو عادی ہوجاتا ہے، حرام سے بچنا بھی کوئی ایسا مشکل کام نہیں لیکن ذبیحہ کا معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ حاضرین کی اکثریت کا خیال تھا کہ مجبوری کی حالت میں بسم اللہ پڑھ کر کسی بھی حلال جانور کا گوشت کھایا جاسکتا ہے جبکہ کچھ لوگ اسے حرام قرار دے رہے تھے۔ خدا بھلا کرے عالم آن لائن، کیو ٹی وی اور کچھ دوسرے مذہبی پروگرام کا جنھوں نے نان ایشوز پر بے مقصد بحثیں کر کر کے لوگوں کو اس قدر کنفیوز کر دیا ہے کہ اس نوع کے عملی طور پر جگہ جگہ پیش آنے والے معاملات اور سوالات کا بھی کوئی تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ لے دے کے ایک جاوید غامدی صاحب ہیں جو دوٹوک بات کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اللہ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے، انشاء اللہ ان سے اس مسئلے پر رائے لوں گا۔ کاش ہم نے وقت پر اجتہاد کیا ہوتا تو آج ہر آدمی اپنا اپنا اسلام ڈنڈے کی طرح دوسروں پر نہ آزماتا۔

جاپان میں پاکستانیوں کی آمدورفت اور سیاسی روابط کی تاریخ تو پرانی ہے لیکن وہاں مستقل طور پر قیام پذیر اور کاروبار کرنے والوں کی تعداد سفارت خانے کے اعداد و شمار کے مطابق ۸۶۱۰ ہے اور ان میں سے بھی ۸۰ فیصد لوگ گزشتہ بیس برس میں یہاں آئے ہیں اور کم و بیش سب کے سب سیکنڈ ہینڈ گاڑیوں کے کاروبار سے متعلق ہیں جنہیں پتہ نہیں کیوں ری کنڈیشنڈ کہا جاتا ہے۔

جاپان کے قوانین کے مطابق یہاں رہائش رکھنے اور کاروبار کرنے کے لیے جاپانی بیوی کا ہونا ضروری ہے، سو معدودے چند لوگوں کو

چھوڑ کر سب نے ہی مقامی عورتوں سے شادیاں کر رکھی ہیں اور بیشتر ایک ٹکٹ دو مزے لے رہے ہیں۔ مالی آسودگی کی وجہ سے کیونکہ دو دو گھر چلانا کوئی مشکل نہیں اس لیے وہ اس قانون شکنی کو مصلحت اندیشی اور ضرورت کا نام دے کر مطمئن ہیں۔

البتہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اپنا قیام قانونی ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنی ''ضرورت'' والی بیویوں سے نباہ کرتے ہیں اور مطلب نکل جانے کے بعد ان سے پیچھا نہیں چھڑاتے۔ سو اس مشاعرے میں بھی خواتین کی اکثریت جاپانی عورتوں کی تھی جو اپنے شوہروں کے ساتھ ان کی تہذیب کا ایک مظہر دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔

اشتہارات اور بینرز میں مشاعرے کے ساتھ ساتھ ایک کھلے مذاکرے کی اطلاع بھی دی گئی تھی۔ غالباً اس سے منتظمین کی مراد Open House Debate نما کسی چیز سے تھی لیکن ہوا یہ کہ ہم تینوں نے جاپان' اردو اور دونوں ملکوں کے تاریخی روابط کے بارے میں کچھ خیر سگالی کی باتیں کی اور سوال جواب کے سیشن میں حاضرین نے کمیونٹی کو درپیش مسائل کا ذکر کیا۔ پاکستانی سفارت خانے کی نمائندگی فرسٹ سیکرٹری عبدالواحد خان نے کی۔ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی کمیونٹی اور ایمبیسی کے درمیان تعلقات کوئی زیادہ خوشگوار نظر نہیں آئے' جس کی تفصیل سے ہمیں بعد میں آگاہی ہوئی۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اصل مسئلہ اختلافات اور شکایات کا نہیں ابلاغ اور اعتماد کا ہے جو ذرا سی سنجیدہ کوشش سے حل ہو سکتا ہے۔ ہم نے دونوں پارٹیوں کو حفیظ ہوشیار پوری کے اس شعر پر غور اور عمل کرنے کی دعوت دی کہ

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے' باہم نہ ہوں گے

مشاعرہ در مشاعرہ

کرکٹ کے ٹیسٹ میچ اگر بغیر کسی اور میچ کے اوپر تلے ہوں تو انہیں Back to Back کہا جاتا ہے لیکن اگر دو مشاعرے یکے بعد دیگرے منعقد ہوں تو انہیں کیا کہا جائے گا' یہ سوال ہمیں جاپان میں درپیش آیا جب ٹوکیو کے مشاعرے سے اگلے دن ٹویاما میں مشاعرے کی خبر سنائی گئی۔ اس مسئلے کا حل سودا کے ایک شعر میں ملا جو کچھ یوں ہے کہ

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

لیکن اس ''مشاعرہ در مشاعرہ'' کے احوال سے پہلے کچھ اور باتوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ پاکستان جاپان ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری ملک حبیب الرحمٰن نے بتایا کہ جاپان کی وزارت خارجہ اور کلچر ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے انہیں مسلسل فون' فیکس اور ای میل پر پیغامات ملے ہیں کہ ان کے مہمانوں کی وہ لوگ بھی میزبانی کرنا چاہتے ہیں اب میرا اور عطاء کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں کو اپنی اپنی مصروفیات

کے باعث جلد واپس آنا تھا۔ اس نوع کی دعوت محمود شام کو جاپان کے کراچی قونصلیٹ کے حوالے سے بھی مل چکی تھی۔ سو وہ رک گئے اور تادمِ تحریر جاپانی تہذیب و تاریخ سے متعلق ایک مطالعاتی دورے میں مصروف ہیں لیکن جس بات سے ہمارے میزبان بجا طور پر متاثر تھے وہ یہ تھی کہ دو ماہ پہلے ہمارے دو تین مرکزی وزیر جاپان سے ہو کر گئے تھے لیکن مذکورہ محکموں نے ان کے آنے جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یہ بات اس امر پر شاہد ہے کہ جاپانی لوگ اہلِ سیاست سے زیادہ اہلِ ادب و فن کی عزت کرتے ہیں۔

ٹوکیو کے مشاعرے کی سب سے اہم بات پروفیسر ہیرو جی کتاؤ کا اور جاپانی طالب علم نشی مورا شوبے کی گفتگو تھی۔ پروفیسر کتاؤ کا دائتو بنکا یونیورسٹی کے استاد ہیں (جن کے کریڈٹ پر غالب اور فیض کی شاعری کے جاپانی متراجم ہیں) اور نشی مورا شوبے ان کا ہونہار طالب ہے جو اپنے استاد سے بھی زیادہ صاف اور فر فر اردو بولتا ہے۔ پروفیسر کتاؤ کا نے بتایا کہ وہ ہر سال اپنے طلبہ کو باری باری پاکستان اور ہندوستان کا مطالعاتی دورہ کرواتے ہیں تاکہ وہ اس تہذیب اور ماحول کو بھی سمجھ سکیں جس کی زبان وہ سیکھ رہے ہیں نوجوان شاعر عامر بن علی کے اس شعر کو بہت پسند کیا گیا۔

حسن اور حکومت پر زور کس کا چلتا ہے
یہ بتاؤ ان کی عمر کتنی ہوتی ہے؟

اگرچہ مشاعرہ گاہ میں تقریباً ہر خاتون کے ساتھ ایک دو بچے تھے جو حسبِ توفیق رونے، چلانے اور دوڑنے بھاگنے میں مصروف تھے لیکن ایک بچہ کچھ زیادہ ہی ناراض تھا۔ اس کی جاپانی ماں اور پاکستانی والد اگرچہ گاہے بگاہے اسے خاموش کرانے کے لیے ہال سے باہر لے جاتے تھے۔ لیکن واپس آتے ہی وہ اپنا کام دوبارہ شروع کر دیتا۔ بعد میں اس کے والد نے بڑی معصومیت سے وضاحت کی کہ دراصل یہ اس کا پہلا مشاعرہ تھا۔

اس پر مجھے پیرس کا ایک مشاعرہ یاد آیا جس میں ایک بزرگ اپنے بچوں کے اصرار پر پہلی بار کسی شعری محفل میں شریک ہوئے پانچ چھ شاعر گزرنے کے بعد انہوں نے اپنی بہو کا کندھا ہلایا اور بڑے تشویش آمیز لہجے میں بولے۔

''شاعر ہی آتے جا رہے ہیں۔''

ٹوکیو سے ٹویاما کار سے کوئی چھ سات گھنٹے کا سفر تھا میزبانوں کی کوشش تھی کہ یہ سفر بذریعہ ہوائی جہاز کیا جائے تاکہ مہمانوں کو زحمت نہ ہو اور انہیں آرام کا موقع مل سکے لیکن خلافِ معمول اس دن رش کچھ زیادہ تھا اس لیے ممکنہ فلائیٹ پر سیٹیں نہ مل سکیں ٹویاما میں ہمارے پاس صرف ایک ہی دن تھا چنانچہ اگلے دن دوپہر کی فلائیٹ پر جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہم جاپان کے اس شہر کی سیر سے محروم رہ جاتے جہاں پاکستانی سب سے زیادہ تعداد میں تھے۔ سو ہمارے اصرار پر یہی طے پایا کہ بذریعہ کار رات کا سفر نسبتاً بہتر ہے کہ گپ شپ میں وقت

آسانی سے کٹ جائے گا اور ہم دو بجے تک منزل پر پہنچ کر سونے کے قابل بھی ہوسکیں گے صرف اگلی صبح کا ناشتہ ذرا لیٹ ہوجائے گا۔

کاروں کے تاجران کی مہمانی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سفر کے لیے جو کار منتخب کی گئی اس میں نہ صرف ہم آٹھ آدمی بمعہ سامان سما گئے بلکہ اس کی وسعت داماں ایسی تھی کہ غالب کی طرح ''بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل'' کا احساس بھی نہیں ہوا البتہ عطا' امتیاز گوندل اور زبیر کی سگریٹ نوشی سے فضا بار بار میر صاحب کی یاد دلاتی تھی جنہوں نے کہا تھا۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

امتیاز گوندل نے ٹویاما شہر میں پاکستانیوں کی آمد اور وہاں استعمال شدہ گاڑیوں کے کاروبار کے فروغ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ یہ شہر روسی سرحد سے قریب ہے اس لیے اس کاروبار سے متعلق روسیوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے جو عام طور پر مافیا کی شکل میں کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جاپانی مافیا کے لوگ بھی اس کاروبار میں موجود غیر معمولی منافع کے باعث کبھی کبھی کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جاپان کا قانون اور وہاں کی پولیس ایسے سخت' انصاف پسند اور غیر جانبدار ہیں کہ پاکستانی تاجر پوری آزادی اور احساس تحفظ کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور قانون ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونے دیتا۔ باتوں باتوں میں پاکستان کی ایک خاتون صحافی کا ذکر بھی آیا جس نے اپنے انگریزی اخبار میں ٹویاما کی پاکستانی کمیونٹی کے خلاف سنی سنائی' بلا تحقیق اور مافیا کی پھیلائی ہوئی خبروں پر مبنی ایک رپورٹ شائع کی جس کی وجہ سے جاپانی میڈیا میں قرآن پاک کی شہادت کے ایک واقعے کو بہت توڑ مروڑ کر پیش کیا بعد کی تحقیقات ثابت ہوگیا کہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی جس کا مقصد پاکستانیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا' انہیں حکومت کی نظروں میں مشکوک بنانا اور کاروں کے کاروبار کے میدان سے بھگانا تھا۔ امتیاز گوندل نے بڑے فخر سے بتایا کہ کمیونٹی کی اجتماعی کوششوں کے باعث نہ صرف مقامی پولیس اور حکومت کے شبہات دور ہوئے بلکہ میڈیا نے بھی اپنا رویہ تبدیل کیا اور اب ٹویاما کی پاکستانی کمیونٹی کو ہر جگہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

محمود شام نے بتایا کہ متعلقہ صحافی خاتون کسی جرنیل کی عزیزہ ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی غلط اور متنازعہ رپورٹیں پیش کر چکی ہے جن کا ادارے نے نوٹس تو لیا ہے مگر صورت حال کے بارے میں صحیح اور مفصل معلومات نہ ہونے کے باعث معقول محاسبہ نہیں ہو پاتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ لوگ سفارت خانے کے توسط سے اس نوع کے معاملات کو متعلقہ اداروں کے علم میں باضابطہ طور پر لائیں تاکہ اس طرح کے واقعات کی روک تھام ہوسکے۔ اس پر بات پھر سفارت خانے کے غیر ہمدردانہ اور منفی طرز عمل کی طرف مڑگئی اور ملک حبیب الرحمٰن نے شکایات کا ایک ایسا دفتر کھول دیا جسے بند کرنے کے لیے زبیر نے گاڑی ایک پارکنگ میں روک دی۔ جاپان میں موٹروے پر واقع سروسز ایریا کو پارکنگ کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کا جواب ہمارے میزبانوں کو بھی نہیں آتا چنانچہ انہوں نے مہمانوں سے فرداً فرداً پوچھنا

شروع کر دیا کہ وہ کیا کھانا پسند کریں گے؟

تیار خوراک کے ایک بہت بڑے کاؤنٹر کے سامنے ایک بار پھر حلال حرام اور ذبیحہ کی بحث شروع ہو گئی۔ عامر بن علی میرے لیے مشین سے گرم کافی کا ایک ٹن نکال لایا جو میرے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ آج تک میں نے دنیا بھر میں اس طرح کی مشینوں سے یخ بستہ مشروبات ہی نکلتے دیکھے تھے۔ میں نے یہ سمجھ کر چپس اور کافی پر اکتفا کرنا چاہا کہ یہ بالکل محفوظ خوراک ہے لیکن زبیر نے مجھے چپس کا لفافہ کھولنے سے روک کر اس میں شامل اجزاء اور استعمال ہونے والے خوردنی تیل کا جائزہ لیا اور بتایا کہ یہ معاملہ کچھ مشکوک ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی جگہ ایک اور کمپنی کے ساختہ چپس لے آیا مگر دل میں جو گرہ پڑنی تھی وہ پڑ چکی تھی' سو وہ پیکٹ آخر تک ان کھلا ہی رہا۔

ٹویاما کا قصبہ نما شہر ایک پہاڑی علاقے میں واقع ہے لیکن ہم ان پہاڑوں پر سے اس طرح گزرے کہ نہ پہاڑیوں کو خبر ہوئی اور نہ ہمیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ٹوکیو سے ٹویاما تک تقریباً چالیس ایسی سرنگیں راستے میں پڑتی ہیں جن میں سے بعض کی لمبائی میلوں پر محیط ہے یہ سرنگیں تقریباً انجینئرنگ کا شاہکار کہی جا سکتی ہیں کہ ان کی خوبصورتی اور صناعی کے بیان کے لیے کوئی مناسب تشبیہ اور مثال کم از کم میری دیکھی ہوئی دنیا میں تو نہیں ہے اور واضح ہو کہ میں نے خاصی دنیا دیکھ رکھی ہے۔

ٹویاما......جاپانی پاکستان

ٹویاما میں ہمارا قیام عامر بن علی کے اپارٹمنٹ میں تھا جس میں ہماری آمد عرب کے روایتی اونٹ جیسی تھی کہ ایک ایک بیڈ روم میرے اور محمود شام کے حصے میں آیا اور عطا نے اپنا بستر لیونگ روم کے فرش پر جما لیا کہ بوجوہ اسے فرشی بستر سوٹ کرتا تھا۔ مالک مکان کو داخلی دروازے کے بالکل ساتھ دائیں ہاتھ پر واقع اس ڈربہ نما دفتر میں جگہ ملی جہاں سونے کے لیے جگہ صرف جاپان ہی میں نکالی جا سکتی ہے۔

عامر نے ہمارے لیے جاپان کے مخصوص شب خوابی کے لبادوں کا اہتمام کر رکھا تھا لیکن ہم تینوں نے ان پر شلوار قمیض کو ترجیح دی کیونکہ بصورت دیگر غالب امکان یہی تھا کہ انہیں پہن کر سونے کا نتیجہ ہمارے گاؤں میں استعمال ہونے والی دھوتی سے مختلف نہ ہو گا جسے دیہاتی بھائی کمر پر باندھ کر سوتے ہیں اور صبح وہ ان کے اوپر چادر کی طرح پڑی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات نہیں بھی پڑی ہوتی۔

صبح قریباً آٹھ بجے عطا نے میرا کندھا ہلایا اور کہا تم بہت سو چکے ہو اٹھ جاؤ اب میری باری کیونکہ میں اب تک ایک پل بھی نہیں سو سکا۔ میں نے کہا' میں نے خود تمہارے غیر انسانی قسم کے خراٹے سنے ہیں۔ بولا' وہ میں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے لے رہا تھا کہ آخر رات تو کسی طور کاٹنی تھی۔ سو میں اٹھ کر لیونگ روم میں آ گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو خوب دن چڑھا ہوا تھا۔ اب پتہ چلا کہ جاپان کو چڑھتے سورج کی سرزمین کیوں کہا جاتا ہے۔

ناشتے کا انتظام امتیاز گوندل کے دفتر میں تھا جہاں دیسی پراٹھے ہمارے منتظر تھے لیکن تیار ہوتے اور نکلتے ہوئے دوپہر کے گیارہ بج

گئے۔ سو طے ہوا کہ ناشتے سے برنچ کا کام لیا جائے لیکن بات اس سے بھی آگے نکل گئی کیونکہ ناشتے کے ہر آئٹم کا ''باورچی'' جداگانہ تھا اور ہر ایک کی کوشش تھی کہ اس کی پیشکش پر زیادہ توجہ دی جائے۔ سو اس موقعے پر قتیل شفائی مرحوم بہت یاد آئے جن کا ایک مصرعہ ہے۔

بٹ نہ جائے ترا بیمار مسیحاؤں میں

اور پھر اسی رعایت سے مرحوم حسن رضوی بھی یاد آیا کہ وہ ہر مشاعرے میں قتیل سے شرارتاً اس غزل کی فرمائش کرتا تھا اور پھر اس کے مطلع پر زیر لب ایسے ایسے دلچسپ تبصرے کرتا تھا کہ پاس بیٹھے ہوئے دوستوں کو ہنسی روکنا مشکل ہوجاتی تھی۔ چلیے لگے ہاتھوں وہ مطلع بھی پڑھ لیجیے۔

رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لیے پاؤں میں

امتیاز گوندل کے شوروم (جسے وہاں پارکنگ کہا جاتا ہے) کے ارد گرد کئی میل تک وقفے وقفے سے طرح طرح کی کاریں ہزاروں کی تعداد میں کھڑی تھیں جہاں سے انہیں دنیا کے مختلف ملکوں میں بھجوایا جاتا ہے جن میں سرفہرست لاطینی امریکہ کے ممالک تھے۔ ان کے علاوہ بڑی مارکیٹوں میں روس، دوبئی، پاکستان اور افریقہ کے کچھ ملک شامل تھے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ پورے جاپان سے جمع کردہ استعمال شدہ کاریں مقررہ دنوں پر نیلام کے پیش ہوتی تھیں اور خریدنے والے کمپیوٹر کے ذریعے بولی لگاتے اور بڑھاتے تھے اور عام طور پر ایک کاروومنٹ سے کم عرصے میں فروخت ہوجاتی تھی یعنی کمپیوٹر سکرین پر صرف کار کی تصویر اور چند بنیادی معلومات نمودار ہوتی تھیں اور خریدار اپنے اپنے دفتروں میں بیٹھے ''کلک'' کے ذریعے اپنی مطلوبہ یا پسندیدہ کار کی بولی میں حصہ لے کر اسے خرید لیتے تھے اور یہی وہ کاروبار تھا جس میں پاکستانی گزشتہ پندرہ بیس برس سے چھائے ہوئے تھے۔ امتیاز گوندل اور وہاں پر موجود دیگر پاکستانی کار ڈیلر دوستوں کا خیال تھا کہ اگر حکومت پاکستان انہیں موقع دے تو وہ پاکستان میں بہترین کاریں انتہائی کم قیمت پر فراہم کرسکتے ہیں۔ جاپانی لوگ عام طور پر تین سال کے بعد کار بدل لیتے ہیں سو بیشتر کاریں ایسی عمدہ حالت میں ہوتی ہیں کہ ان میں اور نئی کار میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے اور قیمتوں کا عالم یہ ہے کہ ۱۳۰۰ سی سی کی کار اس نیلامی میں پاکستانی کرنسی کے مطابق ڈیڑھ لاکھ میں مل جاتی ہے۔ کرایہ کاغذات کی تیاری اور تمام ٹیکس شامل کر کے یہ کراچی میں پانچ سوا پانچ لاکھ میں پہنچ جاتی ہے جبکہ یہاں مقامی طور پر تیار کی ہوئی نسبتاً بہت ناقص کاروں سے بارہ لاکھ کے درمیان پڑتی ہے۔ موجودہ بجٹ میں پانچ سال سے زیادہ پرانے ماڈل کی کاروں کی امپورٹ پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ تو یا ما کے پاکستانی کار ڈیلرز کا خیال تھا کہ یہ قدم پاکستان میں تیار ہونے والے کاروں کی طلب بڑھانے اور ان کے بزنس میں ملوث صاحبان اقتدار کو تحفظ دینے کے لیے اٹھایا گیا ہے ورنہ اب بھی عام آدمی کو چھوٹی کار بہت اچھی حالت میں انتہائی سستی قیمت پر مل سکتی ہے۔

میں چونکہ اس معاملے کی تفصیلات نہیں جانتا لہٰذا ممکن ہے کہ حکومت پاکستان کے پاس اپنی اس پالیسی کا کوئی معقول جواز ہو لیکن ایک عمومی تاثر یہی ہے کہ اگر ان استعمال شدہ گاڑیوں کی امپورٹ میں آسانیاں پیدا کی جائیں تو پاکستانی عوام کو دو ڈھائی لاکھ میں بہت اچھی اور پائیدار گاڑیاں مل سکتی ہیں۔

امتیاز گوندل کے دفتر سے ہم لوگ تین چار گاڑیوں کے ایک قافلے کی صورت میں چلے اور چند ایسے دفتروں میں رکے جن کے مالکان کا تعلق مشاعرہ کمیٹی سے تھا یہ گویا ایک خیر سگالی کا دورہ تھا جس کا مقصد پاکستانی کمیونٹی میں اتفاق اور بھائی چارے کے جذبات کو ابھارنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا کہ یہ مشاعرہ اس شہر میں ہونے والی پہلی باقاعدہ ادبی تقریب تھی۔ امتیاز گوندل نے بتایا کہ ہماری یہ چند منٹ کی وزٹ ان احباب کو مدتوں یاد رہے گی اور وہ آئندہ کمیونٹی کے کاموں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ میں نے امتیاز گوندل کو مشورہ دیا کہ اسے آئندہ انتخابات میں اپنے علاقے منڈی بہاؤالدین کی کسی سیٹ سے الیکشن لڑنا چاہیے کیونکہ ایسی سیاسی سوجھ بوجھ والے لوگ ہماری اسمبلیوں میں کم کم ہیں اس پر ملک ممتاز نے لقمہ دیا کہ پاکستان میں سیاست 'لیاقت' سے نہیں دولت سے کی جاتی ہے اور اگر وہاں ہمارے پاس دولت ہوتی تو ہم یہاں آتے ہی کیوں!

مشاعرے سے پہلے' ہماری یقین دہانیوں کے باوجود کہ ہم عامر کے اپارٹمنٹ میں بہت آرام سے ہیں' ہمیں کینال پارک ہوٹل میں منتقل کر دیا گیا اور دلیل یہ دی گئی کہ چونکہ مشاعرہ بھی وہیں ہے اس لیے ہمیں آرام کرنے اور تیار ہونے میں آسانی ہوگی چنانچہ ایک بار پھر سامان سمیٹا اور پھیلایا گیا۔ اس مشاعرے کا ہال بھی نسبتاً بڑا تھا اور سامعین بھی تعداد میں ٹوکیو سے زیادہ تھے البتہ ایک بات مشترک تھی کہ دونوں جگہ کسی مقامی شاعر نے اپنا کلام بلاغت نظام پیش نہیں کیا ملک ممتاز نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہاں لوگ ہندسوں میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ ان کے پاس لفظوں کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب عامر بن علی کوئی نئی غزل کہہ لے تو اسے سامعین کی تلاش میں پاکستان جانا پڑتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اسے ایک شعر بیس ہزار جاپانی ین (دس ہزار پاکستانی روپے) اور ایک غزل دس مان (ایک مان = سو امریکی ڈالر) میں پڑتی ہے۔ اس بات کا سب سے زیادہ لطف عامر بن علی نے لیا کہ وہ فطرتاً ایک خوش طبع نوجوان ہے اور اچھا جملہ کہنے اور سہنے کی تاب رکھتا ہے۔

مشاعرے کے بعد کھانا ایک کورین ریستوران میں تھا جس کی انفرادیت یہ تھی کہ ہر میز کے درمیان ایک برقی انگیٹھی نصب تھی۔ بیرے آرڈر کے مطابق کچا لیکن سلیقے سے کٹا ہوا مرغ' مچھلی اور گائے کا گوشت پلیٹوں میں لا کر رکھ دیتے تھے' جسے گاہک خود آگ کے اوپر رکھی ہوئی ایک جالی پر سینکتا' پکاتا اور کھاتا تھا۔ میری جھجک دیکھ کر میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک مقامی میزبان نے سبزیوں کے نام پر پتہ نہیں کیا الا بلا لا کر میرے سامنے رکھ دیا اور ریستوران والوں کو تھرتھلی ڈال دی کہ وہ کوئی ایسی چیز تیار کر کے دیں جو میں کھا سکوں لیکن

سوائے سفید چاول کے چند لقموں کے دل کسی چیز کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سو میں نے اللہ کا نام لے کر اور بسم اللہ پڑھ کر چکن کے چند قتلے نوش جان کئے کہ مجبوری میں تو بہت سہولتیں دی گئی ہیں یہاں تو صرف ذبیحے کا مسئلہ تھا اور بقول ہمارے ایک دوست کے اگر آپ کبھی پاکستان میں مرغیاں ذبح ہوتے دیکھ لیں تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

اوساکا اور سویمانے

عامر بن علی کے دوست اعجاز سے دن میں اس کے دفتر میں سرسری ملاقات ہوئی تھی جس میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ اتنی کم عمری کے باوجود ایک بہت اچھا اور کامیاب بزنس مین ہے۔ کھانے کے دوران اس سے بات چیت ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ خاصا زندہ دل اور جملے باز بھی ہے لیکن اس کے اصل جوہر اس وقت کھلے جب وہ ہم تینوں مہمانوں کو رات کے کھانے کے بعد ٹویاما اور اس سے ملحقہ ایک دو چھوٹے چھوٹے شہروں کی سیر کرا رہا تھا راستے میں اس نے کھانے میں شریک مقامی کمیونٹی کے کچھ احباب کے بارے میں ایسے دلچسپ' مختصر مگر کٹیلے تبصرے کئے کہ ہمارا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا وہ بھی غالباً اسی اصول پر عمل پیرا تھا کہ بندہ بے شک ضائع ہو جائے جملہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

شب گردی کے دوران اچانک ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں بہت سی لڑکیاں اور لڑکے سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ پہلے تو ہم لوگ یہ سمجھے کہ یہ ہجوم کسی سینما گھر یا نائٹ کلب سے نکلا ہے مگر پھر ان کا رنگ ڈھنگ' بے تکلفی اور ہمیں مخاطب کرتی ہوئی آوازیں سنیں تو شبہ ہوا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ہم نے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اعجاز نے بڑا اچکا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''یہ پوچھ رہی ہیں کیا آپ مساج کرانا پسند کریں گے؟'' لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت کچھ اور کہہ رہی تھی۔

جاپان اگرچہ امریکہ کی نسبت ایک قدامت پسند ملک ہے لیکن مغربی تہذیب کے زیر اثر وہاں بھی ''نائٹ لائف'' ایک ایسی اصطلاح بنتی جا رہی ہے جس کی آڑ میں جنس فروشی سمیت بہت سے ایسے کاروبار چل رہے ہیں جن میں عورت کو تفریح اور تلذذ کے سامان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کی آزادی اور حقوق کے اتنے شور شرابے کے باوجود وہاں ان سب خرافات کی گنجائش کیسے نکل آتی ہے اور وہ معاشرے جو ایک چڑیا کا پر ٹوٹنے پر بے چین ہو جاتے ہیں وہ عورت کی اس تذلیل پر کیونکر خاموش رہتے ہیں۔ ہم نے اعجاز سے پوچھا۔ ''کیا تم نے وہ گانا سن رکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔ بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں!''

اس نے ترت جواب دیا۔ ''گانا تو مجھے یاد نہیں لیکن آپ کی بات میں سمجھ گیا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی ایک بغلی سڑک کی طرف موڑ دی جہاں دور دور تک نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔

۱۳ جون کو دوپہر دو بجے اوساکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہمیں وہاں کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات سے ملنا تھا۔ ٹویاما سے اوساکا تک

تقریباً چار گھنٹے کا سفر تھا۔ ناشتہ کراتے کراتے دس بج گئے۔ جاپانیوں کی وقت کی پابندی چونکہ ہم سن ہی نہیں دیکھ بھی چکے تھے اس لیے جب ڈاکٹر فخر الحق نوری نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اب معاملات خطرے کی حد کو عبور کرنے ہی والے ہیں تو ہم نے بمشکل میزبانوں سے اجازت لی جنھوں نے ہوٹل کی انتظامیہ کو کہہ کر خاص طور سے مغربی ناشتے کا انتظام کروایا تھا اور اب مصر تھے کہ ہم ان کے حسن انتظام کی داد عملی طور پر دیں یعنی ایک ایک انڈے کا ہمیں دینا پڑا حساب۔

کار چلانے کی ذمہ داری اس بار بھی زبیر فیصل آبادی پر تھی جو بل کھاتی ہوئی سرنگ کی دیواروں سے ایک ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ رکھ کر ایک سو تیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے پیچھے بیٹھے ہوئے دوستوں سے اس طرح مڑ کر بات کرتا تھا کہ اس کی آنکھیں پیچھے آتی ہوئی کاروں کو براہ راست دیکھ سکتی تھیں۔ اس اندھے اعتماد کی وجہ وہ اپنے بائیس سالہ تجربے کو قرار دیتا تھا جو بقول اس کے ایکسیڈنٹ فری تھا۔ اس کا دوسرا شوق موبائل یا ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے مسلسل باتیں کرنا تھا۔ ملک حبیب الرحمٰن اس کی ان دونوں عادتوں سے بہت چڑتے تھے مگر ہر بار آخری فتح زبیر ہی کی ہوئی جس کی حس مزاح واقعی بہت عمدہ تھی۔ وہ انتہائی سپاٹ چہرے کے ساتھ بڑے Casual انداز میں ایسا جملہ کہتا تھا جس کی کاٹ تہہ در تہہ اور بہت تیز ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا مزاح نگار دوست ملتان کا شاعر خالد مسعود بہت یاد آیا کہ وہ بھی اس ہنر کا بادشاہ تھا۔

راستے میں ہمیں عامر بن علی اور مظہر دانش کو بھی لینا تھا جس میں مزید پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ اب ایک طرف ملک حبیب الرحمٰن کی ظاہری اور ڈاکٹر فخر الحق نوری کی پوشیدہ تشویش تھی اور دوسری طرف زبیر کی خود اعتمادی کہ میں نہ صرف آپ کو دو بجے سے پہلے اوساکا یونیورسٹی پہنچاؤں گا بلکہ راستے میں چائے کا وقفہ بھی ہوگا اور لطف کی بات ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

بعد میں زبیر نے بتایا کہ اس نے چائے کے وقفے کے دوران اس علاقے کا ایک ایسا روڈ میپ حاصل کر لیا تھا جس کے مطابق ایک شارٹ کٹ کے ذریعے تقریباً ۳۰ میل کا فاصلہ کم ہو گیا۔ چنانچہ جب دو بجنے میں دس منٹ پر ہماری گاڑی یونیورسٹی کے مرکزی دروازے میں داخل ہوئی تو زبیر نے جن نظروں سے ملک حبیب الرحمٰن کو دیکھا ان پر کوئی قتل شتل بھی ہو سکتا تھا۔

سویمانے کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ اورینٹل کالج میں نیا نیا آیا تھا اور ایسی کتابی (Bookish) اردو بولتا تھا جسے سننے کو ہمارے کان ترس چکے تھے۔ اس کے ہل ہل کر بولنے اور ہر وقت ہنستے رہنے کا انداز ذہن پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑتا تھا۔ اس کے بعد گاہے بگاہے اس سے سنگ میل پبلی کیشنز کے دفتر میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس کا غلام عباس کے فن و شخصیت پر کیا ہوا کام اردو کے غیر ملکی طلبہ میں اسے منفرد و ممتاز کرتا ہے۔ چند ماہ قبل لاہور میں ملاقات کے دوران میں نے اس سے اپنے بارے میں زیر اشاعت کتاب ''ستارے مرے ہم سفر'' بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ پچھلے دنوں عزیزی عامر بن علی مجھ سے ملنے آیا تو میں نے وہ کتاب اس کے ہاتھ بھجوا دی اور سنگ میل

کے افضال احمد سے سویمانے کا فون نمبر لے دیا کہ اس سے ایڈریس لے کر کتاب بھجوا دینا۔ چند دن بعد عامر بن علی کا فون آیا اس نے کہا کتاب تو میں نے بھجوا دی ہے مگر آپ تو کہتے تھے کہ سویمانے فر فر اور بہت اچھی اردو بولتا ہے۔ یہ آدمی تو انگریزی بھی واجبی سی بول رہا تھا۔
بعد میں پتہ چلا کہ وہ سویمانے نام کا کوئی اور آدمی تھا جو اینتھرو پالوجی کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اور اس سلسلے میں پاکستان بھی آ چکا تھا اور یہ کہ سویمانے جاپان میں ویسا ہی عام اور مستعمل نام ہے جیسے ہمارے یہاں جاوید پرویز قسم کے نام ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر سویمانے کی مسکراہٹ سمیٹے نہیں سمٹ رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان چند مہینوں میں اس کا وزن خاصا کم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نوری نے بتایا کہ جاپان میں شوگر کا مرض بہت عام ہے اور سویمانے نہ صرف اس کا مریض ہے بلکہ بہت لاپروا اور غیر محتاط بھی ہے۔ میں نے سوچا کہ وقت ملا تو ہم دونوں ہم مرض اور شوگر شریک بھائی اس موضوع پر تبادلہ خیال کریں گے لیکن تقریب کی دوڑ بھاگ میں آپس کی کسی بات کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ سو میں نے دم رخصت اسے انور مسعود کا یہ شعر سنایا اور کہا کہ اس کی تشریح اور تفصیل آئندہ ملاقات پر کی جائے گی۔

مجھ کو شوگر بھی ہے اور پاس شریعت بھی ہے
میری قسمت میں نہ میٹھا ہے نہ کڑوا پانی

ترقی کرنے والی قوموں کے طور طریقے

اوساکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استقبالیہ پروگرام کا احوال لکھنے سے پہلے ان چند باتوں کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس دوران میں مختلف وقتوں میں، مختلف لوگوں اور جگہوں کی معرفت معلوم ہوئیں اور جن سے ایک بار پھر اس بات کی حقانیت ثابت ہوئی کہ خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اس کے لیے سوچتی اور تگ و دو نہیں کرتی۔ زمانہ حال میں شاید اس کی بہترین مثال جاپانی قوم اور جاپان کی ترقی ہی ہے۔
عام طور پر ہر ملک کے کرنسی نوٹوں پر اس کے حکمرانوں یا اس کی تحریک آزادی کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں ہوتی ہیں، جاپان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جس کے کرنسی نوٹوں پر بادشاہ، ملکہ، شاہی خاندان یا سیاستدانوں کے بجائے ادیبوں، شاعروں، سائنس دانوں اور سماجی رہنماؤں کی تصویریں شائع کی جاتی ہیں۔ موجودہ نوٹوں پر موجود اہل تصویر کے ناموں اور کارناموں کی تفصیل تو مجھے نہیں مل سکی لیکن پانچ ہزار ین کے نوٹ پر جس خاتون شاعرہ کی تصویر ہے اس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ انیسویں صدی کی ایک بڑی شاعرہ تھی اور تقریباً ہمارے مرزا غالب کی ہم عصر تھی۔
جاپانی اپنے بچوں اور قوم کی کردار سازی کس طرح کرتے ہیں اس کی تفصیلات بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ سو میں ان کے تعلیمی اور معاشرتی سسٹم پر تو شاید روشنی نہ ڈال سکوں لیکن اس کے نتائج اور ثمرات پر یقیناً بات ہو سکتی ہے کہ جاپانیوں سے ملتے وقت قدم قدم آپ کو ان

خوبیوں کا احساس ہوتا رہتا ہے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں بد ترین شکست کھانے کے باوجود اس قوم کو دنیا کی بہترین قوموں میں سے ایک بنا رکھا ہے۔ شاید اس واقعے کا ذکر میں نے پہلے بھی کہیں کیا ہے اگر ایسا ہے بھی تو یہ بات ایسی ہے جسے صحیح معنوں میں قند مکرر کہا جا سکتا ہے۔

ایک دوست نے بتایا کہ جاپان میں اپنی ملازمت کا دورانیہ ختم کرنے کے بعد جب وہ پاکستان آ رہا تھا تو اسے کچھ جاپانی دوستوں اور رفیقان کار نے مختلف تحفے پیش کیے۔ جواباً اس نے بھی ایک مہربان جاپانی بزرگ رفیق کار کے لیے ایک تحفہ خریدا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ جاپان میں اشیا کی خریدار پر ایک Consumption ٹیکس لگتا ہے جو غیر ملکیوں سے اس لیے وصول کیا جاتا ہے کیونکہ اس ٹیکس کی غایت یہ ہے کہ یہ کسی چیز کے جاپان کے اندر استعمال ہونے پر لاگو ہوتا ہے۔ دوست نے بتایا کہ پہلے تو جاپانی بزرگ نے تحفہ لینے میں ہی بہت تامل کا اظہار کیا لیکن میری بات کا قائل ہونے کے بعد اس نے ایک عجیب و غریب فرمائش کی اور کہا کہ میں اس شرط پر یہ تحفہ قبول کروں گا اگر تم اس کی خریداری رسید بھی مجھے ساتھ دو گے۔

ہماری معاشرتی اقدار کے حوالے سے تحفے کے ساتھ اس کی خریداری کی رسید مانگنا ایک انتہائی غیر معمولی اور بد ذوقی کی بات تھی سو پہلا خیال جو میرے دوست کے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ شاید وہ رسید کے ذریعے اس تحفے کو واپس کر کے اپنی مرضی کی کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے یا پھر۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کے استفسار پر اس جاپانی بزرگ نے جو جواب دیا وہ سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے کہ اس سے پوری قوم کا کردار جھلک رہا ہے۔ اس نے کہا۔

''یہ رسید میں تم سے اس لیے مانگ رہا ہوں کہ بطور غیر ملکی تم نے اس پر ''مقامی استعمال'' کا ٹیکس ادا نہیں کیا تھا سو میں اسے استعمال کرنے سے پہلے جا کر یہ ٹیکس ادا کروں گا تاکہ قومی امانت میں خیانت نہ ہو۔''

اب اس بات کو اس خبر سے ملا کر پڑھئے کہ گزشتہ چند ماہ میں چینی کی قیمتوں اور سپلائی کے حوالے سے جو ڈرامہ ہوا اس میں چند اہل زور وزرنے مل کر اس غریب قوم کے عوام کی کمائی میں سے اربوں روپے چھین لیے اور ڈکار تک نہیں لی۔

چلئے اب واپس اوساکا یونیورسٹی چلتے ہیں ورنہ یہ تحریر بھی داغ کے اسی شعر کی تفسیر بن جائے گی۔

کچھ اور کام بھی اے داغ تم کو آتا ہے
وہی بتوں کی شکایت وہی گلہ دل کا

اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر تاکامتیو' ماتو مورا ہیں جن کے چہرے سے ان کی عمر کا اندازہ کرنے میں دس بیس سال کی غلطی ایک معمولی اور قابل معافی بات ہے کہ بیشتر جاپانیوں کی طرح ان کا چہرہ بھی ایک طرح کی ''دھوکہ منڈی'' ہے کہ

ان کے نقوش کے بازی گر بھی کواکب کی طرح کھلا دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ فیکلٹی چار اساتذہ پر مشتمل ہیں۔ ماتو مورا' سویمانے اور ڈاکٹر فخر الحق نوری کے علاوہ پروفیسر کین ساکو ماما بھی یہاں پڑھاتے ہیں جن سے ہماری ملاقات تقریب کے اختتام پر ہوئی کہ وہ کسی اور جگہ مصروف تھے۔

تقریب کا عنوان ''محفل اردو'' رکھا گیا تھا ہال میں تقریباً ستر کے قریب جاپانی لڑکے اور لڑکیاں موجود تھے اور بیشتر نے پاکستانی یا اس سے ملتے جلتے لباس پہن رکھے تھے البتہ سامنے کی دو صفوں میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں بڑے زرق برق اور آرائشی قسم کے کپڑے اور زیورات پہنے ہوئے تھیں اور کچھ نے پھولوں سے بھی سنگھار کر رکھا تھا۔ حیرت ہوئی کہ جاپان میں لڑکیوں کے لیے اردو پڑھنے کی خاطر ''امراؤ جان ادا'' بننے کی شرط کیوں عائد کی گئی ہے مگر جلد ہی اس راز سے پردہ اٹھ گیا۔ سویمانے نے مہمانوں کے سامنے چھپا ہوا پروگرام بھی رکھا اور پھر زبانی تفصیل بھی بتائی کہ ان طالبات نے ابھی کچھ دیر بعد کورس کی شکل میں ایک رقص پیش کرنا ہے اور یہ ساری تیاری اسی کی لیے ہے۔

استقبالیہ کلمات کے بعد سب سے پہلے طلبہ نے کورس کی شکل میں ایک مشہور پاکستانی فلمی گیت ''جان بہاراں' رشک چمن' اے جان من!'' پیش کیا جس کا ایک مقصد شاید یہ بتانا بھی تھا کہ اوساکا یونیورسٹی والے اردو اور فارسی کے تاریخی رابطوں سے بخوبی واقف ہیں۔ چھ نمبر پر درج آئٹم کا عنوان تھا ''طبلے پر تھاپ پڑنا'' اور سات نمبر کے آگے لکھا تھا ''جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ'' دونوں عنوان بہت دلچسپ اور منفرد نوعیت کے تھے لیکن طبلے پر تھاپ کچھ ایسے پڑی کہ طبلے کو بھی شاید ہی خبر ہوئی ہو جس کی وجہ شاید طبلہ نواز نوجوان کی نومشقی تھی البتہ طاؤسان باغ کا رقص ایک مشہور بھارتی فلمی گانے ''ڈولی سجا کے رکھنا'' کی مقامی کوریوگرافی پر مشتمل تھا' جس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ ایک غیر زبان کے بولوں اور اجنبی سازوں کی لے پر ایسا خوبصورت موثر رقص پیش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

اس کے بعد پروفیسر ماتو مورا نے اپنے شعبے کی کارگزاریوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ان تراجم کے بارے میں بھی بتایا جو اردو سے جاپانی میں کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں میں چند برس پیشتر احمد ندیم قاسمی کی معرفت دیکھ چکا تھا کہ ''سناٹا'' اور ''پرمیشر سنگھ'' کے نام سے ان کے افسانوں کے جاپانی میں تراجم بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اس کے بعد ہمیں کلام سنانے کے لیے کہا گیا جو اس لحاظ سے ایک مشکل مرحلہ تھا کہ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ دونوں کی اردو بہت کتابی نوعیت کی تھی اور شعر پڑھتے وقت یہ دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ نجانے ابلاغ ہو بھی رہا ہے یا نہیں' اس کا ایک فائدہ البتہ ضرور ہوا کہ عامر بن علی اور مظہر دانش سمیت پانچوں مہمان شاعر دس منٹ میں نبڑ گئے۔

آخر میں طلبہ طالبات کو مہمانوں سے اردو زبان و ادب کے بارے میں سوال کرنے کے لیے کہا گیا۔ سوالات کا معیار بہت اچھا تھا اور اگر یہ انہیں پہلے سے تیار نہیں کروائے گئے تھے پھر تو بہت ہی اچھا تھا۔ شروع شروع میں اس بات پر الجھن ہوئے کہ جب یہ اردو کے طلبہ

ہیں توسویمانے نے ہمارے جوابات جاپانی میں ترجمہ کر کے کیوں سنائے ہیں مگر بعد میں بتایا گیا کہ ان میں سے کئی طلبہ ابھی چار سالہ کورس کے پہلے سال میں ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے ہماری ادبی اصطلاحات سے پر اور تیزی سے بولی جانے والی اردو کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس پر پتہ نہیں کیوں مجھے انور مسعود کا وہ شعر بہت یاد آیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کاش کبھی کوئی انگریز میرے پاس ایک فارم لے کر آئے اور کہے کہ اسے پر کر دیجئے اور وہ فارم اردو میں ہو۔

ٹوکیو میں واپسی

اوساکا سے ہمیں جاپان کی مشہور زمانہ "بلٹ ٹرین" کے ذریعے ٹوکیو آنا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے نام کی مناسبت سے گولی کی رفتار سے چلتی ہے اس کی اوسط رفتار تین سو کلومیٹر فی گھنٹہ بتائی جاتی ہے۔ عامر بن علی نے بتایا کہ آج کل جس ٹرین پر کام ہو رہا ہے وہ اس سے دوگنی رفتار یعنی چھ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے چلا کرے گی۔ واضح رہے کہ یہ رفتار فوکر ٹائپ کئی ہوائی جہازوں کی حد رفتار سے بھی زیادہ ہے۔

اب مسئلہ یہ آپڑا کہ دوپہر کا کھانا کب' کہاں اور کیسے کھایا جائے کہ اب تو سہ پہر بھی ڈھلا چاہتی ہے کسی 'اپنے' ٹائپ کے ریستوران کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ خاصے فاصلے پر ایک ذیلی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایسی ایک جگہ ہے لیکن یہ طے نہیں کہ وہاں سے اپنی مطلوبہ بلٹ ٹرین مل سکے گی یا نہیں۔ خاصی بحث کے بعد ایک مقامی پاکستانی دوست کی رہنمائی میں ایک تیر سے دو غیر یقینی شکار کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور زبیر فیصل آبادی کو پابند کیا گیا کہ وہ اگلی گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے۔ اب یہ بات اس کی ڈرائیوری اور راستہ شناسی کی صلاحیت کے لیے ایک تازیانے سے کم نہ تھی۔ چنانچہ سارے سفر میں اس نے اگلی گاڑی کے ڈرائیور کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ یقیناً جاپان میں قابل دست اندازی پولیس ہوں گے۔ سٹیشن کے سامنے واقع ایک بڑے سے راؤنڈ اباؤٹ کے کئی چکر لگانے کے بعد بالآخر ہم لوگ ایک تنگ سی سڑک پر واقع ایک پارکنگ میں داخل ہوئے۔ زبیر کا خیال تھا کہ اگر قیادت اسے سونپی جاتی تو ہم کم از کم بیس منٹ کے فالتو سفر سے بچ جاتے' پتہ نہیں کہاں سے ایک بھولا بھٹکا شعر دھیان میں گونج اٹھا۔

بھٹکنے والوں کو کیا فرق اس سے پڑتا ہے
سفر میں کون سڑک' کس طرف کو جاتی ہے

اس چھوٹے سے انڈین ریستوران کا نام "علی بابا" اور مالک ایک پاکستانی لڑکا تھا جس کا تعلق کراچی سے تھا۔ دوپہر کے وقفے کے بعد ریستوران ابھی ابھی کھلا تھا چنانچہ فی الوقت یہی نوجوان باورچی' تندورچی' ویٹر' منیجر اور مالک کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر زبیر کی رگ کارکردگی پھڑک اٹھی اور اس نے سارا انتظام فوراً اپنے ہاتھ میں اس طرح لے لیا کہ کچھ دیر بعد ہوٹل والا اس سے

ہدایات لینے لگا۔ بھوک کی شدت اور گرم کھانے میں قدرت نے یہ عجیب کمال رکھا ہے کہ وقتی طور پر اس سے ذائقے کی حس زائل ہو جاتی ہے چنانچہ ابتدائی چند لقموں میں وہ نوجوان امیر مطبخ اور تمام کھانے ''کوکب کا دستر خوان'' لگے البتہ جب خلال کا وقت آیا تو اندازہ ہوا کہ سب سے بہتر چیز تازہ سلاد اور اس کے ساتھ آنے والی چٹنی ہی تھی۔

ابتدائی پروگرام یہ تھا کہ زبیر ہمیں بلٹ ٹرین پر سوار کرا کے واپس آیا تو یاما اور عامر بن علی نیا گاتا چلا جائے گا جہاں اس کے کاروں کے کاروبار کا مرکزی دفتر ہے مگر تفتیش پر پتہ چلا کہ بلٹ ٹرین پکڑنے کے لیے ہمیں جاپان کے سابق صدر مقام اور تاریخی شہر کیوٹو جانا ہوگا اور عامر کو زبیر کے ساتھ واپس تو یاما جانا پڑے گا کیونکہ یہاں سے اس کی منزل کا راستہ بہت پیچ دار اور لمبا ہے۔ کیوٹو تک کی مسافت صرف بیس پچیس منٹ کی تھی چنانچہ ہم محاورتاً پلک جھپکنے میں وہاں پہنچ گئے۔ ریلوے سٹیشن کا ماحول ہوائی اڈوں جیسا تھا ہم نے ٹوکیو جانے والی بلٹ ٹرینوں کی روانگی کے اوقات دیکھے تو معلوم ہوا کہ آئندہ ایک گھنٹے میں چھ ٹرینیں یہاں سے ٹوکیو جا رہی ہیں جن میں سے پہلی آٹھ بج کر نو منٹ اور دوسری آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر روانہ ہوگی جاپانیوں نے اس ٹرین کا نام ''نزومی'' رکھا ہے جس کا اردو میں قریب ترین متبادل ''خیال'' ہے یعنی یہ ٹرین خیال کی طرح تیز رفتار ہے۔ ملک حبیب الرحمٰن اور مظہر دانش نے ٹکٹ خریدے اور ہم اس نام کی معنویت کی داد دیتے ہوئے متعلقہ پلیٹ فارم پر پہنچ گئے۔ ہماری بوگی کا نمبر سولہ تھا۔ پلیٹ فارم پر ہر بوگی کے رکنے کی جگہ اس کے نمبر کے حساب سے درج تھی تاکہ مسافروں کا ہجوم نہ ہو اور لوگ اپنی اپنی بوگی کے رکنے کی جگہ کے سامنے کھڑے ہوں۔ یوں ٹرین کے رکنے پر متعلقہ بوگی کا دروازہ مسافروں کے عین سامنے ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے میں سو ڈیڑھ سو کے قریب مسافر چڑھتے اور اترتے ہیں اور دھکم پیل تو کیا کسی کا کندھا بھی ایک دوسرے کو نہیں چھوتا۔ ہم ابھی تیرہ نمبر بوگی کے رکنے کی جگہ پر تھی کہ ٹرین آگئی۔ مظہر دانش نے بتایا کہ ہم یہاں سے داخل ہو کر اندر اندر چلتے ہوئے سولہ نمبر بوگی تک پہنچ سکتے ہیں' سو بسم اللہ کیجئے۔

سولہ نمبر بوگی میں ہمارے نمبروں والی چار سیٹیں تو خالی تھیں مگر ایک پر ایک تیس سے ساٹھ سال کی کسی بھی درمیانی عمر کی خاتون لمبی تانے سو رہی تھی۔ یہ پہلی لاقانونیت اور بے ترتیبی تھی جو جاپان میں نظر آئی۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے میر کارواں ملک حبیب الرحمٰن کی طرف دیکھا مگر وہ کبھی ٹکٹوں اور کبھی بوگی کے دروازے پر جاپانی زبان میں لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بولے' لگتا ہے ہم غلط ٹرین میں بیٹھ گئے ہیں۔ یہ آٹھ بج کر نو منٹ والی گاڑی ہے جبکہ ہمارے پاس سوا آٹھ بجے والی گاڑی کی ٹکٹیں ہیں۔

ایسے لگا جیسے بلٹ ٹرین کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی ہو ملک صاحب نے اپنی تھکی ہوئی آواز کو مزید بٹھاتے ہوئے کہا کہ وہ کسی متعلقہ بندے سے مل کر اس سمسیا کا حل دریافت کرتے ہیں اچھی بات یہ ہوئی کہ دونوں ٹرینیں ٹوکیو ہی جا رہی تھیں سو ہمیں بتایا گیا کہ یہ ٹرین قریباً چالیس منٹ بعد ''ناگویا'' کے سٹیشن پر رکے گی ہمیں چاہیے کہ وہاں اتر کر چھ منٹ بعد اس ٹرین میں سوار ہو جائیں جس کی ٹکٹیں ہمارے

پاس ہیں۔ معلوم ہوا کہ کیوٹو اور ٹوکیو کے درمیان یہ ٹرین صرف دو جگہ رکتی ہے پہلا سٹاپ ناگویا ہے اور دوسرا یوکوہاما۔ ناگویا کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ وہاں ٹویوٹا کاریں بنتی ہیں۔

محمود شام نے اپنی سیٹ کے سامنے لگی ٹرے نما ٹیبل کھولی اور روزنامہ ''جنگ'' کے لیے اپنا آج کا کالم ''ٹوکیو سے ایک خط'' لکھنے میں مصروف ہوگئے۔ میں نے اس سے پہلے صرف اطہر شاہ خان عرف جیدی کو اس طرح بھری محفل میں اس قدر یکسوئی کے ساتھ لکھتے دیکھا ہے۔ ناگویا کے سٹاپ کی آمد کے اعلان کے ساتھ محمود شام نے کاغذ سمیٹنے شروع کردیئے۔ معلوم ہوا ''خط'' لکھا جاچکا ہے ٹرین بدلنے کے چھ منٹ اگر بیچ میں سے نکال دیئے جائیں تو عطا کے خراٹوں کو باآسانی ''مسلسل'' کہا جاسکتا ہے۔ سفر میں اس کی Instant نیند کا یہ عالم ہے کہ کبھی کبھی تو وہ سیٹ میں بیٹھنے سے پہلے خراٹے شروع کردیتا ہے۔

ٹوکیو کے ریلوے اسٹیشن سے ہمارے ہوٹل کا فاصلہ اتنا کم تھا کہ اسے فاصلہ کہنا بھی زیادتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ پلیٹ فارم سے نکل کر سڑک کراس کی تو بائیں ہاتھ پہلی ہی سڑک کے کونے پر وہ دو خواتین نظر آگئیں جو روزانہ شام کو ہمارے ہوٹل کے گردونواح میں غالباً ہوا خوری کے لیے آیا کرتی تھیں۔ انہوں نے حسب معمول ہماری طرف ایک خیر سگالی کی مسکراہٹ پھینکنا چاہی مگر ملک حبیب الرحمٰن نے انہیں کچھ ایسی سرزنش بھری نظروں سے دیکھا کہ وہ گھبرا کر اس ریستوران کی طرف چل پڑیں جہاں ہم کچھ دیر بعد کھانے کے لیے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ غالباً اسی کو پرانے لوگ ''حسن اتفاق'' کہا کرتے تھے۔

جاپان' جوہی چاولہ اور پروفیسر کتاؤکا

۱۴ جون کا دن دائتو بنکا یونیورسٹی کے لیے مخصوص تھا جس کے شعبہ اردو کے انچارج ہیروجی کتاؤکا کا تعارف میں پہلے کروا چکا ہوں۔ یہ یونیورسٹی ہماری رہائش گاہ سے تقریباً دو گھنٹے کے فاصلے پر تھی۔ منتظمین نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ یہ سفر انڈر گراؤنڈ ٹرین کے ذریعے کیا جائے کہ اس طرح نہ صرف مسافت کم پڑے گی بلکہ یہ زیادہ باسہولت بھی رہے گا۔ لیکن شاید حساب کتاب کے وقت یہ نہیں دیکھا گیا کہ درمیان میں دو دفعہ ٹرین بدلنی بھی پڑے گی اور صبح کے وقت ہجوم بھی زیادہ ہوگا۔ سو ہوا یہ کہ عطا کو سالہا سال کے تجربے اور مہارت کے باوجود سونے کا موقع نہ مل سکا اور میں اس بات پر حیران ہوتا رہا کہ سٹیشن آنے سے دو سیکنڈ پہلے تک بظاہر مراقبے میں غرق ہمارے جاپانی ہم سفر کس طرح چشم زدن میں ایسے ہوشیار اور تازہ دم ہوجاتے ہیں جیسے نیند کبھی ان کی آنکھوں میں تھی ہی نہیں۔

ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ آج صبح کا ناشتہ پاکستان ایسوسی ایشن کے دفتر میں تویاما سے آئے ہوئے ملک ممتاز اور عزیزی مظہر دانش کی مشترکہ پیش کش تھا۔ ڈبل روٹی کے پیس غالباً ہاتھیوں کو سامنے رکھ کر کاٹے گئے تھے کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے ان کی اوسط موٹائی ڈیڑھ سے دو انچ تھی اور سائز بھی ایسا ''جمبو نما'' تھا کہ ایک ٹوسٹ سے پوری پلیٹ بھر جاتی تھی۔ آملیٹ جیسے زبان حال سے چیخ چیخ کر

اعلان کر رہا تھا کہ اس کے تیار کنندگان نے یہ کام تجرباتی بنیادوں پر کیا ہے اور یہ کہ وہ اور جو بھی بن جائیں باورچی کبھی نہیں بن سکتے۔
ہمارے ان خوش دلانہ تبصروں کا سب سے زیادہ مزہ ملک ممتاز نے لیا کہ وہ بنیادی طور پر ایک سپورٹس مین مزاج کا شخص ہے جو دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی بنا لینے کی حیرت انگیز اور خوبصورت صلاحیت رکھتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے بے غرض محبت کرنے والے لوگ اب زیادہ تر پردیس ہی میں ملتے ہیں۔

اب اس سے پہلے کہ بات بے مہری ارباب وطن کے گلہ ہائے گرہ در گرہ کے غبار میں گم ہو جائے ہم واپس دائتو بنکا یونیورسٹی کے نزدیکی ریلوے سٹیشن پر چلتے ہیں جس کے قریب سے یونیورسٹی کی بسیں ذرا ذرا سے وقفے کے بعد مسلسل چلتی رہتی ہیں۔ دور سے دیکھا تو بس سٹاپ پر کوئی سو سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں بظاہر بے ترتیبی سے کھڑے تھے۔ ان کی عمروں اور اپنے پاکستانی تجربے کے حساب سے اس مجمعے کو چھٹنے کے لیے کم از کم آدھ گھنٹہ درکار تھا جس کے دوران ایک آدھ لڑائی جھگڑا معمول کی بات ہے لیکن ہمارے وہاں پہنچنے تک دو دو منٹ کے وقفے سے تین بسیں آئیں اور بغیر کسی دھکم پیل اور شور شرابے کے بس سٹاپ تقریباً خالی ہو گیا اور ہم اگلی بس میں ایسے اطمینان سے سوار ہوئے جیسے اسے خاص طور پر ہمارے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہمارے مطلوبہ سٹاپ تک پہنچنے کے دوران بس دو جگہ رکی' بہت سی سواریاں اتریں اور چڑھیں لیکن بے حد مستعد ہونے کے باوجود کسی کی باڈی لینگوئج میں جارحیت اور شدت نظر نہیں آئی۔ معلوم ہوا کہ وہاں طلبہ امتحان کی تاریخیں آگے بڑھانے یا کورس کم کرنے کی بجائے زیادہ اور بہتر تعلیم کی فراہمی کے لیے احتجاج کرتے ہیں اور وہ بھی اس سلیقے سے کہ آدمی عش عش کر اٹھے۔

یہ مظہر دانش کا علاقہ تھا کہ وہ استادی سے پہلے یہاں شاگردی بھی کر چکا تھا اور اس کی جاپانی یقیناً اس کے رفقائے کار کی اردو سے بہتر تھی۔ ہمیں ایک لمبے چوڑے برآمدے میں ایک سائیڈ پر بنی ہوئی کچھ سنگی کرسیوں پر بٹھا کر وہ بذریعہ موبائل پروفیسر کتاؤکا کی موجودہ پوزیشن کا پتہ کرنے لگا جس نے فون پر اسے بتایا تھا کہ سابقہ پروگرام کے مطابق اب براہ راست شعبہ اردو میں جانے کے بجائے پہلے ہماری ملاقات یونیورسٹی کے ایک ڈائریکٹر سے کرائی جائے گی جو بلحاظ عہدہ وائس چانسلر سے ملتی جلتی کسی پوزیشن پر فائز تھا۔ عطا کو یہ تبدیلی اس لیے زیادہ پسند آئی کہ ہمارا عارضی پڑاؤ پوری یونیورسٹی کے ان چند مخصوص حصوں میں سے ایک جگہ تھا جہاں سگریٹ نوشی کی اجازت تھی۔ سو اس نے جلدی جلدی اس اصول کے مطابق سگریٹ پیا جیسے اونٹ اپنے کوہان میں پانی کا ذخیرہ کر لیتا ہے۔

چند ہی لمحوں میں پروفیسر کتاؤکا اپنے مخصوص شرمیلے انداز میں ہنستے اور پھرکی کی طرح گھوم گھوم کر مخصوص جاپانی انداز میں کورنشیں بجا لاتے ہوئے تشریف لے آئے اور انہوں نے ایسی بامحاورہ مسجع اور مقفیٰ اردو میں ہماری آمد کا شکریہ ادا کیا کہ ہماری اردو ان سردار جی کی طرح ہو گئی جن سے لکھنو کے کسی صاحب نے جب یہ پوچھا کہ

''حضرت قبلہ سردار صاحب کیا یہ حقیر پر تقصیر جناب والا کا اسم گرامی پوچھ سکتا ہے؟'' تو سردار صاحب نے گھبرا کر جواب دیا تھا۔

''پوچھو''

پروفیسر کتاؤ کی معیت میں ہمارا قافلہ جب ڈائریکٹر صاحب کے دفتر کی طرف روانہ ہوا تو مظہر نے بتایا کہ پروفیسر صاحب اپنے مہمانوں کے دس منٹ دیر سے پہنچنے کی وجہ سے بہت فکر مند تھے کیونکہ انہیں اطلاع ملی تھی کہ ہائی وے پر کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔

میں نے کہا۔ ''صبح ہمارے سامنے تو تم نے انہیں بتایا تھا کہ ہم لوگ بذریعہ ٹرین آ رہے ہیں' پھر؟'' مظہر دانش نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات پریشان ہونے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہائی وے کے ذکر سے ایک بڑا مزیدار لطیفہ دہرایا گیا جو کچھ یوں تھا۔

''ایک بزرگ موٹروے پر گاڑی چلاتے ہوئے جا رہے تھے کہ موبائل پر ان کی بیگم کا فون آیا۔ انہوں نے میاں کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد سمجھانے کے انداز میں کہا کہ گاڑی ذرا احتیاط سے چلانا' ابھی ابھی ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ کوئی بے وقوف موٹروے پر ون وے کی خلاف ورزی کرتا ہوا جا رہا ہے جس کی وجہ سے کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔'' بڑے میاں نے تیزی سے سٹیرنگ گھمایا اور کہا۔ ''ایک نہیں سارے ہی کم بخت ون وے توڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔''

پروفیسر کتاؤ کا بڑے مہمان نواز' معاملہ فہم اور فنافی الاردو شخص ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی حس مزاح بھی بہت عمدہ ہے چنانچہ یقین کامل ہے کہ وہ اس لطیفے کو لطیفہ ہی سمجھیں گے ورنہ بعض احباب تو کسی کی کھانسی کو بھی اپنے اوپر طنز سمجھ لیتے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب نے بتایا کہ پاکستانی طلبہ' اساتذہ اور دانشوروں کے لیے ان کی یونیورسٹی کے دروازے کھلے ہیں اور وہ اس ضمن میں ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہیں ہم نے بھی جواباً ایسے ہی خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کیا اور توقع ظاہر کی کہ مستقبل قریب میں کئی نئے شعبوں میں پاک جاپان تعاون کی راہیں کھلیں گی۔

مظہر دانش نے پروفیسر کتاؤ کا کے دفتری کمرے کی اس قدر تعریف کر رکھی تھی کہ اب اس کی زیارت ایک طرح سے ہم پر واجب ہو چکی تھی۔ اب جو دیکھا تو جیسا سنا تھا اس سے کچھ بڑھ کر پایا کہ اس میں آگے پیچھے' دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات چند بھارتی اداکاراؤں کی بڑی بڑی فریم شدہ تصویریں تھیں جو ان کتابوں کے اوپر دیواروں کے ساتھ لگی تھیں۔ زیادہ تر تصویریں جوہی چاولہ کی تھیں جس کے ذکر پر کتاؤ کا صاحب اس طرح شرماتے تھے کہ ان کا چہرہ لال اور جسم بے تال ہو جاتا تھا ہم نے انہیں جوہی چاولہ کے ہرجائی پن کے کچھ سنے سنائے اور فرضی کئی طرح کے قصے سنائے مگر ان کی ہنسی کی گرم جوشی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ ہماری کسی بات نے ان کے جذبہ پسندیدگی پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں کیا۔ ان کا رویہ اس نوجوان عاشق جیسا تھا جسے

اس کے باپ نے اس کی محبوبہ کے کئی منفی خصائل بتائے مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ میں نے اس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ تنگ آ کر اس کے باپ نے کہا کہ میرے پاس پکے ثبوت ہیں کہ اس لڑکی کا گاؤں کے ہر لڑکے کے ساتھ معاشقہ رہ چکا ہے۔ نوجوان عاشق نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔ ''پھر کیا ہوا ابا' چھوٹا سا تو ہمارا گاؤں ہے۔''

ایک طرف مادھوری ڈکشٹ کی بھی ایک تصویر رکھی تھی۔ میں نے کہا اس کے جملہ حقوق تو مصور ایف ایم حسین نے محفوظ کرا رکھے ہیں اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ کتاؤ کا صاحب نے تو اس بات کا جواب نہیں دیا مگر ان کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ اس لیے جنگ کی طرح محبت میں بھی سیکنڈ ڈیفنس لائن ضروری ہوتی ہے۔

یہ تو خیر ہنسی مذاق کی باتیں تھیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مشفق خواجہ مرحوم کی گھریلو لائبریری سے قطع نظر پروفیسر کتاؤ کا کے اس کمرے میں موجود اردو کتابیں شاید ہی تعداد کے اعتبار سے کسی اور شخص کی ذاتی لائبریری میں موجود ہوں۔

جاپان کی لائبریری میں اردو کتابیں

پروفیسر کتاؤ کا کے شعبے کا نام جنوب مشرقی ایشیائی زبانوں کا شعبہ ہے اردو ان میں سے ایک زبان ہے چنانچہ ہم جس کلاس میں لے جائے گئے اس میں بھانت بھانت کی زبانیں بولنے اور سیکھنے والے ایک ہی چھت کے نیچے جمع تھے۔ تعارفی کلمات کے بعد پروفیسر کتاؤ نے بتایا کہ اب وہ طلبہ و طالبات کو ایک ایسا میوزک ویڈیو دکھائیں اور سنوائیں گے جس کی زبان وہ نہیں جانتے لیکن اس کا جو تاثر ان کے دل و دماغ پر ہوگا اسے وہ پہلے سے دیئے گئے کاغذوں پر دو تین جملوں میں بیان کریں گے جن کا ترجمہ کر کے ہم مہمانوں کو سنایا جائے گا کہ وہ بھی اس مشق سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ٹی وی سکرین پر نصرت فتح علی کی ایک ایسی قوالی دکھائی گئی جو غالباً جاپان ہی میں کہیں ریکارڈ ہوئی تھی۔ نصرت فتح علی کی صحت اور دیگر قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اس کی وفات سے دس بارہ برس پہلے کا کوئی پروگرام تھا۔

جن پچیس تیس طلبہ و طالبات نے اپنے تاثرات قلمبند کئے ان میں سے تقریباً ۹۰ فیصد نے اسے ایک روحانی تجربہ اور ایک ایسی کیفیت قرار دیا جس کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے اور بعض نے تو انتہائے شاعرانہ جملوں میں اظہار خیال کیا۔ محمود شام ایک سندھی چادر بطور تحفہ پیش کرنے کے لیے لائے ہوئے تھے۔ وہ انہوں نے کتاؤ کا صاحب کو پہنانے کے بجائے اس طالبہ کو پہنا دی جس نے سب سے اچھا جملہ لکھا تھا' جو کچھ یوں تھا۔

''اس موسیقی کو سن کر روح پر مستی سی چھا جاتی ہے۔''

اگلا پروگرام لائبریری کا دورہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں بارہ لاکھ کے قریب کتابیں موجود ہیں اور مختلف فلور پر بیٹھ کر مطالعہ کرنے کی اتنی

گنجائش ہے کہ بیک وقت ایک ہزار سے زیادہ طلبہ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ لائبریری کے عملے کے کچھ افراد ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں لائبریری کی نوعیت' تاریخ اور طریق کار کے بارے میں کچھ مطبوعہ مواد بھی پیش کیا اور مختلف سیکشنز بھی دکھائے۔ غالباً چھٹے یا ساتویں فلور کی شیشے کی دیوار سے نیچے جھانکا تو من جملہ دیگر بہت سی چیزوں اور عمارتوں کے ایک مصنوعی جھیل بھی نظر آئی گزشتہ دو دنوں سے محمود شام تقریباً ہر ملنے والے سے یہ سوال کر رہے تھے کہ جاپان میں اتنی زیادہ خودکشیاں کیوں اور کیسے ہوتی ہیں اور ان کے صحیح اعداد و شمار کہاں سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی جھیل کو دیکھ کر جو پہلا سوال انہوں نے ہماری رہنما خاتون سے کیا وہ یہی تھا کہ کیا اس جھیل کو لوگ خودکشی کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اور اگر ایسا ہے تو اس کی تفصیل کہاں سے مل سکتی ہے۔ رہنما خاتون ایک بے چاری سیدھی سادی سی لائبریرین تھی جس کی انگریزی بھی واجبی سی تھی سوکتنی دیر تک تو اس کی سمجھ میں یہ سوال ہی نہیں آیا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے پروفیسر کتاؤ کا کی طرف دیکھا جو اپنے مخصوص انداز میں پہلے جھکے پھر ہنسے اور پھر لہرائے اور بڑے وثوق سے جواب دیا کہ یہاں اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ محمود شام نے اپنے سوال کا دائرہ جھیل سے پھیلا کر پوری یونیورسٹی تک بڑھا دیا لیکن ان کا سوال فلیش گنوں کی چمک اور تصویریں کھینچنے والوں کی ''ریڈی'' اور ''سمائل پلیز'' کی آوازوں میں کھو گیا جو ہماری لائبریری کی اس وزٹ کو محفوظ کرنا چاہ رہے تھے۔

بیشتر کتابیں جاپانی زبان میں تھیں سو ہم زیادہ سے زیادہ ان کے سرورق اور جلد بندیوں کی تعریف ہی کر سکتے تھے۔ پروفیسر کتاؤ کا نے مشورہ دیا کہ ہمیں زبان و ادب اور بالخصوص اردو کی کتابوں والا سیکشن دیکھنا چاہیے' جو عمارت کے تہہ خانے میں واقع تھا۔ سائنس' ٹیکنالوجی اور دیگر جدید علوم کے مقابلے میں زبان و ادب اور سوشل سائنسز کی کم قیمتی کا تو ہمیں پہلے سے اندازہ تھا لیکن ان کی بے وقعتی اور پستی کی یہ عملی صورت حال یقیناً افسوس ناک اور غور طلب تھی۔ لائبریری کے عملے نے ایک بند الماری نما چیز کو دو تین دفعہ گھما کر کھولا تو اندر سے شیلف در شیلف رکھی ہوئی اردو کتابیں سامنے آگئیں۔ مجلس ترقی ادب اور کچھ اور اداروں کی شائع کردہ کلاسیکی ادب سے متعلق کتابوں کے ساتھ ساتھ دو تین سو کتابیں جدید ناول' افسانے' تنقید اور شاعری کی بھی رکھی تھیں جن میں سے بیشتر سنگ میل پبلی کیشنز کی شائع کردہ تھیں۔ اتفاق سے جو شیلف بالکل ہمارے سامنے تھا اس میں سے میری چند کتابیں آنکھوں میں ترے سپنے' اپنے لوگ' وقت' سپنے بات نہیں کرتے وغیرہ بھی تھیں۔ مظہر دانش نے ریک سے نکال کر یہ کتابیں ہماری رہنما لائبریرین کو دکھائیں اور کتابوں کے پیچھے چھپی میری تصویریں دکھا کر بتایا کہ ان کا مصنف اس وقت یہاں موجود ہے۔ اب تو جناب ان کی حالت دیدنی تھی۔ انہوں نے انتہائی اشتیاق سے ایک دوسرے کو کتابوں پر چھپی تصویریں دکھا کر میری طرف متوجہ کیا اور پھر تیزی سے میری طرف اشارہ کر کے پروفیسر سے مزید جھک جھک کر کچھ باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے ان کتابوں پر دستخط کروانا چاہتے ہیں کہ مصنف کی دستخط کی ہوئی کتاب ان کے لیے

ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی فرمائش کی تکمیل کے دوران بارہا میرے دل میں ایک پرانا سوال پھر سے ابھرا کہ کب وہ وقت آئے گا جب دنیا اردو زبان میں لکھے گئے عظیم ادبی سرمائے سے آشنا ہوگی اور جان سکے گی کہ اس کا ماضی کس قدر شاندار، حال کیسا وقیع اور مستقبل کتنا درخشاں ہے۔

لائبریری سے فارغ ہو کر ہم شعبے کے ایک دفتر نما کمرے میں آئے جہاں ہم تینوں نے پروفیسر کتاؤ کا کو یونیورسٹی لائبریری کے لیے اپنی کچھ کتابیں پیش کیں ہر کتاب کو وصول کرنے کے بعد پروفیسر کتاؤ کا اظہار تشکر کے لیے رکوع کے انداز میں اتنی بار جھکتے کہ انہیں روکنا مشکل ہو جاتا۔ کتاب اور اہل ادب کی تکریم کا یہ منظر اس بات کا شاہد ہے کہ زندہ قوموں کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد پروفیسر کتاؤ کا نے ہمیں کتابی شکل میں جاپانی ترجمہ شدہ اردو کی کچھ تحریریں دکھائیں جن میں سے کچھ تو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن منٹو کی ''گورکھ سنگھ کی وصیت'' غلام عباس کی ''آنندی'' اور پروفیسر کتاؤ کا کے کیے ہوئے فیض اور غالب کے تراجم پہلی بار نظر سے گزرے۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے ایک جاپانی النسل نومسلم خطاط پروفیسر فواد کا تعارف نامہ اور مصورانہ خطاطی کے نمونوں پر مشتمل بروشر بھی ہمیں دیا اور دکھایا گیا۔ معلوم ہوا کہ عالمی شہرت کے حامل اس مصور کے کام کی نمائش عنقریب پاکستان میں ہونے والی ہے۔ میں اس کا فنی محاکمہ کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہوں لیکن ایک ناظر کی حیثیت سے یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ فواد کا کام منفرد بھی ہے اور اعلیٰ بھی۔

دوپہر کے کھانے کا میزبان مظہر دانش کا ایک پاکستانی تاجر دوست اعجاز رفیق تھا جو بڑے صبر سے ہمارے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ نشی موراشوبے اور اس کا ایک اور جاپانی ہم جماعت بھی ساتھ ہو لیے کہ وہ مہمانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر اپنی اردو بول چال بہتر بنانا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش اس لیے ٹھیک طرح سے پوری نہ ہو سکی کہ اس دوران میں محمود شام کو پاکستان سے موبائل پر اوپر تلے کئی کالز آئیں جن میں یہ بتایا جا رہا تھا کہ ''جنگ'' گروپ کے کون کون سے اہم کالم نگار انہیں چھوڑ کر ''ایکسپریس'' اخبار میں چلے گئے ہیں۔

سائی تامہ میں ایک دن

داتو بنکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے طالب نشی موراشوبے کے بارے میں مختلف حوالوں سے ذکر ہوتا رہا ہے لیکن اس سے صحیح معنوں میں ملاقات گلشن راوی لاہور کے باسی جمشید کے ریستوران میں ہوئی جہاں ہم سب دوپہر کے کھانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ اس کے ساتھی طالب علم کا نام تو ذہن سے نکل گیا ہے بس اتنا یاد ہے کہ وہ جمشید کی تیار کی ہوئی ہر چٹنی کو چکھنے کے بعد طرح طرح کے منہ بناتا تھا اور اس کا چہرہ سامنے رکھے سلاد میں پڑے ٹماٹر کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔ نشی موراشوبے کے مقابلے میں اس کی اردو انتہائی کمزور تھی اور وہ

زیادہ تر ''جی ہاں'' اور ''جی نہیں'' سے کام چلاتا تھا۔ جمشید ایک خوش رو اور ہنس مکھ نوجوان تھا اور اٹھارہ سال سے غریب الوطن ہونے کے باوجود خوش نظر آتا تھا ہمیں اس کی جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ اس کی پاکستانیت تھی جس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ اس نے ہوٹل بزنس کی کاروباری مصلحتوں کی پروا کئے بغیر دروازے کے ساتھ صرف پاکستانی جھنڈا لگا رکھا تھا۔

نتی موراشوبے نے یہاں بھی اپنے محبوب موضوع یعنی جنوں بھوتوں اور تعویذ دھاگے کے بارے میں اپنی گفتگو جاری رکھی اور بتایا کہ جاپان میں بھی بیشتر لوگ جادو ٹونے پر یقین رکھتے ہیں اور یہاں بھی ''ڈبہ پیروں'' کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ کھانا ذائقے اور معیار کے اعتبار سے تو درمیانہ سا تھا مگر جمشید کا نان بائی خاصا کاریگر آدمی تھا سو اس نے ہمیں ہر سائز' شکل اور ذائقے کے حامل نان کھلائے اور خوب خوب داد پائی کہ حاضرین میں سے بیشتر لوگ ''خوراک شناس'' واقع ہوئے تھے۔

خوراک شناسی کے ذکر سے مجھے اپنے ایک دوست کے بڑے بھائی یاد آ گئے جو زندگی کا ہر کھانا آخری کھانا سمجھ کر کھایا کرتے تھے ایک بار شدید گرمیوں کے موسم میں بریانی کھانے کے دوران ان کی نکسیر پھوٹ گئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ دوستوں نے سب مروجہ علاج آزما ڈالے مگر ان کی حالت میں کوئی افاقہ نہ ہوا' مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں ہسپتال شفٹ کر دیا جائے اب جو انہیں رکشہ میں سوار کرنے کی کوشش کی گئی تو انہیں ہوش آ گیا اور انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جو جملہ کہا وہ اپنی مثال آپ ہے' بولے۔

''مجھے کہیں نہ لے جاؤ' مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے اور اب میں نہیں بچوں گا تم ایسا کرو مجھے ایک پلیٹ میں تھوڑی سی بریانی ڈال دو۔''

یہیں گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ جاپان کا قدیم اور اصلی نام Nippon (نی پن) ہے اور یہ کہ اس کا اصل کلچر اور فن تعمیر دیکھنے کے لیے ہمیں سابقہ دارالخلافہ اور قدیمی شہر کیوٹو ضرور جانا چاہیے کہ اگرچہ ٹوکیو اور کیوٹو میں بظاہر صرف حرفوں کا الٹ پھیر ہے مگر یہ جاپان اور نی پن کی طرح ایک ہی قوم اور تاریخ کے دو مختلف رنگوں کے علم بردار ہیں۔

تھوڑی دیر بعد سروس میں جمشید کے ساتھ ایک جاپانی لڑکی بھی شامل ہو گئی جمشید نے اس کا تعارف ویٹرس کے طور پر کروایا لیکن ہمارے مقامی دوستوں کا خیال تھا کہ یہ اس کی مقامی بیوی ہے کیونکہ یہ ایک طرح سے وہاں کا مسئلہ رائج الوقت ہے ہم لوگ البتہ آخر تک تذبذب میں رہے کیونکہ اس عفیفہ کی مسکراہٹیں سب کے لیے ایک جیسی تھیں۔

معلوم ہوا کہ اس علاقے کے سٹورز ٹوکیو کی نسبت کم مہنگے ہیں اور بچوں کے کپڑوں کی خریداری کے لیے یہ انتہائی موزوں جگہ ہے جب سے میری بیٹیاں صاحب اولاد ہوئی ہیں میری زیادہ تر شاپنگ ان کے بچوں سے ہی متعلق ہوتی ہے انسانی زندگی کا یہ پہلو انتہائی دلچسپ اور عجیب و غریب ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی ترجیحات خود بخود بدلتی چلی جاتی ہیں اور بعض اوقات آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ وہی لوگ جو

ایک زمانے میں ایک دوسرے کی خیر خبر پوچھا کرتے تھے کچھ برس بعد بیوی بچوں کا حال احوال دریافت کرنے لگتے ہیں اور پھر یہ معاملہ ایک دوسرے کی بیماریوں اور ڈاکٹروں کے ناموں کی پرسش تک محدود ہو جاتا ہے۔

جاپان نے اپنے آپ کو چند صنعتوں تک محدود کر کے ان پر ایک طرح کی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے مگر بہت سے شعبوں میں اس کا انحصار درآمدات پر ہے جن میں ملبوسات بھی شامل ہیں سو وہاں کی مارکیٹوں میں چین' تھائی لینڈ' کوریا اور تائیوان کا کپڑا اور ریڈی میڈ ملبوسات چھائے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے قیمتی برانڈ ناموں والے مہنگے کپڑے پاکستان میں تیار ہو کر کئی گنا قیمت پر یہاں اور پوری دنیا میں بکتے ہیں لیکن ان پر پاکستان کا نام نہیں ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہی کام اگر پاکستان میں کیا جائے تو اسے چوری اور دو نمبر کا طعنہ سہنا پڑتا ہے۔

رات کا کھانا سائی تامہ میں ہی ایک پاکستانی ہوٹل ''الکرم'' میں رکھا گیا تھا جس کے مالک محمد اصغر سے اگرچہ ہم پہلے بھی پاکستان ایسوسی ایشن کے دفتر میں ایک لنچ پر مل چکے تھے مگر اس وقت وہ دیگ پر بطور ''ورتارا'' بیٹھا تھا اس لیے اندازہ نہ ہوا کہ وہ بنفس نفیس کئی ریستورانوں کا مالک ہے اور یہ بیرا گیری صرف اپنے پاکستانی مہمانوں کی محبت اور احترام میں کر رہا ہے۔ بعد میں یہ بھی پتہ چلا کہ ''الکرم'' ریستوران قریباً ایک سو کلومیٹر کے دائرے میں رہائش پذیر تمام پاکستانیوں کی جائے ملاقات اور ایک طرح کا ڈیرا ہے جہاں تلاش معاش کے گرداب میں چکراتے ہوئے اہل وطن کچھ دیر کے لیے ستا سکتے ہیں کہ یہاں اصغر نے ان کے لیے ایک چھوٹا سا پاکستان بنا رکھا ہے یہاں یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں سے قطع نظر پہلی بار کچھ ایسے احباب ملے جو ادب سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ان میں سے کچھ کا مطالعہ قابل رشک حد تک اچھا تھا۔

اصغر نے سب میزیں کرسیاں ہٹا کر ایک فرشی نشست کا اہتمام کر رکھا تھا مہمانوں کو ایک قدرے بلند جگہ پر بٹھایا گیا جو بیٹھنے کے لیے تو تنگ تھی مگر وہاں کے ماحول اور احباب کی محبت نے اس تنگی میں ایک ایسی وسعت اور گنجائش پیدا کر دی تھی کہ ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی بے آرامی کا احساس نہیں ہوا۔ بہت سے سامعین کو ہم مہمان شعراء کا کلام پہلے سے یاد تھا سو ان کی فرمائشوں کی تعمیل میں کھانا اپنے مقررہ وقت سے کوئی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا لیکن دسترخوان پر سندھی بریانی' پائے' پالک کے ساگ اور لاہوری مرغ چنوں کی موجودگی اس بات کی گواہ تھی کہ اصغر نے مہمانوں کو پاکستانی ماحول دینے کے لیے کتنی محنت کی ہے اس ہنس مکھ اور مہمان نواز شخص کی ایک اور ادا نے ہمیں بہت متاثر کیا مقامی احباب نے بتایا کہ اصغر ہر یوم پاکستان' عید میلاد النبی اور عاشورے کے دن صبح سے شام تک پاکستانیوں کو بلا تخصیص مفت کھانا پیش کرتا ہے اور یہ لنگر صبح سے رات تک چلتا رہتا ہے۔

پاکستانی جھنڈوں سے بھرے ہوئے اس محب وطن اور زندہ دل انسان اصغر کے ریستوران سے نکلتے نکلتے رات کے بارہ بج گئے۔

عزیزی عرفان صدیقی اپنے ایک دوست علی اور اس کی بڑی سی گاڑی کو لے کر وہاں پہنچا ہوا تھا کہ کب ہم فارغ ہوں اور کب وہ ہمیں ٹوکیو کی ایسی سیر کرائے جس کے لیے وہ ہماری جاپان آمد کے وقت سے لے کر اب تک بے چینی سے موقع تلاش کر رہے تھا۔

رات دو بجے کے قریب ہم اپنے ہوٹل واپس پہنچے تو ایک نیا اور دلچسپ مسئلہ ہمارا منتظر تھا۔ میں نے شروع میں شاید کہیں لکھا بھی ہے کہ جاپان میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والے بہت کم ہیں اور بعض اوقات یہ لوگ ایسی جگہوں پر بھی کمیاب ہوتے ہیں جہاں ان کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ سو ہوا یوں کہ ہم نے فرنٹ ڈیسک والوں سے اپنے کمروں کی چابیاں طلب کیں تو انہوں نے کسی اندرونی کمرے سے ایک ایسے شخص کو بلایا جو ان کے خیال میں انگریزی بول اور سمجھ سکتا تھا اس مردِ شریف نے بڑے اطمینان سے بتایا کہ ہماری پہلی بکنگ ختم ہو چکی ہے اور اب ہمیں نئے سرے سے بکنگ کرا کے پیشگی کرنا ہوگی۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی گئی کہ ہمارا سامان ان کمروں میں پڑا ہے اور ہمیں یہاں ابھی مزید دو دن قیام کرنا ہے۔ سو اگر اس معاملے میں کوئی الجھن ہے تو آپ صبح ہمارے میزبانوں سے بات کر لیجیے گا کہ اس معاملے کی تفصیلات ان کے اور آپ کے درمیان ہیں مگر وہ بندۂ خدا اپنی ضد پر اڑا رہا تنگ آ کر ہم نے اسے مطلوبہ ادائیگی کر دی۔ اس دوران میں ملک حبیب الرحمٰن سے فون پر بات ہو چکی تھی سو وہ کچھ ایسے غضب ناک انداز میں وارد ہوئے کہ ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' کا منظر آنکھوں میں گھوم سا گیا۔ ان کی تھکی ہوئی آواز اس وقت ایسی گونجی اور چمکی کہ ہوٹل کے عملے کو جان بچانا مشکل ہو گیا ملک صاحب نے بزبان جاپان ان کی وہ خبر لی اور ان کے اپنے ریکارڈ سے ہماری بکنگ کو اس طرح ثابت کیا کہ ان سب کو اپنی نوکریاں خطرے میں نظر آنے لگیں۔ انگریزی والا آدمی تو فوراً ہی بھاگ گیا اور باقیوں کے جھکنے کا یہ عالم تھا جیسے تیز بارش کا رکا ہوا وائپر فل سپیڈ پر چل رہا ہو۔

ہیروشیما کی کہانی

۱۵ جون ہر اعتبار سے ہمارا جاپان کے اس دورہ کا آخری دن تھا کہ اگلے دن صبح ہماری فلائٹ تھی ہمارے ہوٹل ائیر پورٹ تک کا فاصلہ ایک گھنٹے کا تھا جو ٹریفک کی وجہ بڑھ بھی سکتا تھا۔ سو عامر کے برادر بزرگ عابد حسین نے (جو عمر کے اعتبار سے بزرگ تو کیا ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئے تھے) اپنے تجربے اور دانش سے کام لیتے ہوئے ہماری اس رات کی بکنگ ائیر پورٹ کی حدود میں واقع ہالی ڈے ان میں کرا دی تھی تا کہ ہم جہاز چھوٹ جانے کے ڈر کی اس پریشانی سے بچ جائیں جو میری ناپسندیدہ ترین چیزوں میں سے ہے۔

سات دنوں میں یہ پہلا ناشتہ تھا جسے ''ناشتہ'' کہا جا سکتا تھا کیونکہ ''الکرم'' کے اصغر نے رات کو تقریب کے اختتام پر کھانے کا بہت سا سامان اس طرح ملک حبیب اینڈ کمپنی کے سپرد کر دیا تھا جیسے باراتیوں کے ساتھ کھانے کی دیگیں بھجوائی جاتی ہیں اس سے ایک بار پھر اس احساس میں شدت پیدا ہوئی کہ بیرونِ وطن ڈالر پاؤنڈ ریال اور ین کمانے والے ہمارے بھائی غیر ملکوں میں کس اذیت اور عذاب میں

زندگی گزارتے ہیں اور بظاہر بے شمار سہولتیں ہونے کے باوجود اپنی مرضی کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے انہیں کتنی تگ ودو کرنی پڑتی ہے اور وطن میں چھوٹی چھوٹی اور عام نظر آنے والی خوشیاں کیسے بڑی اور غیر معمولی بن جاتی ہیں۔

درمیانے قد اور چھوٹی سی داڑھی والے زبیر صاحب ہمہ وقت ویڈیو ریکارڈنگ میں مصروف نظر آئے اس لیے ان سے باضابطہ ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اب پتہ چلا کہ وہ الیکٹرانکس کے شعبے میں خصوصی مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف عالمی صورت حال پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ عراق ایران جنگ اور اس کے بعد عراق پر امریکی حملے کے دوران بھی محاذ پر موجود رہے ہیں اور انہوں نے کیمرے کی آنکھ سے ایسے ایسے مناظر قلم بند کیے ہیں جو اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور کہے جا سکتے ہیں ان کا اصرار تھا کہ ہم ان کے پروگرام اردو نیٹ کے لیے انٹرویو ریکارڈ کروائیں۔ اس اردو نیٹ کے بارے میں جو تفصیلات انہوں نے بتائی تھیں وہ میرے ذہن میں بالکل گڈمڈ ہو چکی ہیں یوں بھی کمپیوٹر سے متعلقہ معاملات میں میں کم علم ہی نہیں تقریباً بے علم ہوں۔ سو میں اس پروگرام کی تفصیلات سے اس اصول کے تحت صرف نظر کرتا ہوں جس کی ایک شکل ہمارے پیارے مرحوم بزرگ سید ضمیر جعفری نے اس لازوال شعر کی صورت میں پیش کی ہے۔

وہ جہالت ہیں خاموش تو ہے
لوگ سمجھتے فلسفی انہیں ہیں

زبیر صاحب کے سوالات عام روش سے ہٹ کر اس حوالے سے تھے کہ ہم تیسری دنیا کے ادیب' شاعر اور دانشور (یہ آخری اسم توصیف کچھ زیادہ ہی بھاری ہے) اپنے اردگرد کی دنیا کو کیسے دیکھتے اور اس کے مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں' اتفاق سے ٹوکیو یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے انہی کی گاڑی میں جگہ ملی سو رستے میں بھی گفتگو کا موقع ملا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے اہل وطن غیر ملکی میڈیا کے سیلاب میں اگرچہ تنکوں کی طرح ہیں لیکن اس کے باوجود جہاں اور جتنا موقع ملتا ہے پاکستان کے امیج کو بہتر بنانے کے لیے بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز تک کے سارے راستے میں بارش ہمارے ساتھ ساتھ چلتی رہی مگر مجال ہے کہ کسی سڑک پر پانی کھڑا نظر آیا ہو یا کوئی ٹریفک لائٹ بند ملی ہو۔ اس حوالے سے کئی بار دھیان وطن عزیز کی طرف گیا جہاں بارش کے حسن پر نگاہ ڈالنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اس کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے کئی سسٹم فیل ہو جاتے ہیں۔

ٹوکیو کی اس یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے انچارج اسادا ہا گیتا صاحب کی شکل بہت جانی پہچانی لگی لیکن اس سے پیشتر کہ میں ذہن پر زور ڈال کر یہ یاد کر سکتا کہ ان سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی' انہوں نے سب سے پہلے تو مصافحہ کرتے وقت میرا نام لے کر مجھے حیران کیا اور پھر فر فر ہماری گزشتہ ملاقات کا احوال اور تفصیلات کچھ اس طرح سنائیں کہ معاملہ پریشانی کی حدوں کو چھونے لگا۔ زندگی میں کئی بار ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کی یادداشت غیر معمولی تھی لیکن اسادا ہاگیتا کو اس گروہ کی پہلی صف میں شامل کرنا چاہیے کہ انہوں نے مجھے دن'

مہینہ، سال، وقت اور مقام سمیت یاد کرایا کہ ہم آخری بار شاعرہ اور پولیس آفیسر نیلما درانی کے دفتر میں ملے تھے اور اس مختصر ملاقات میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ پروفیسر اسادا عام جاپانیوں سے قدرے زیادہ ہنستے اور نسبتاً کم جھکتے تھے اور ان کی گفتگو میں امریکیوں جیسی بے تکلفی اور اعتماد تھا شاید اس کی ایک وجہ اس یونیورسٹی کا ماحول ہو جہاں بھانت بھانت کی زبانیں اور کلچر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔

پروفیسر اسادا نے بتایا کہ ان کے شعبے کے طلبہ و طالبات آج کل ایک سٹیج ڈرامے کی تیاری میں مصروف ہیں جس کا نام ''ہیروشیما کی کہانی'' ہے اور جس کی تھیم نئی نسل اور دنیا کو جنگ کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرنا اور اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تیار کرنا ہے۔

اس سے پہلے بھی وہ ایک کھیل پاکستان اور ہندوستان میں پیش کر چکے ہیں جسے بہت پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس بار وہ ایک ماہ کے لیے پاکستان کے تین شہروں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں یہ کھیل پیش کریں گے۔ ہر شہر میں کل تین شو ہوں گے۔ لاہور میں ایک شو لاہور کالج یونیورسٹی برائے خواتین کے ساتھ پہلے سے طے ہو چکا ہے۔ البتہ باقی دو شوز کے بارے میں وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں تعلیمی اداروں میں کیا جائے یا کسی ایسی جگہ جہاں ہر طرح کے لوگ انہیں دیکھ سکیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ یہ شوز الحمرا آرٹ کونسل کے ہال میں کریں جو نہ صرف سہولیات کے اعتبار سے موزوں ترین ہے بلکہ وہاں مختلف طرح کے ناظرین بھی مہیا ہو سکتے ہیں اس پر اسادا نے میرے ساتھ وہی کیا جسے عرف عام میں ''جو بولے وہی کنڈی کھولے'' کہتے ہیں۔ سو میں نے آتے ہی ریذیڈنٹ ڈائریکٹر لاہور آرٹ کونسل اصغر گیلانی صاحب سے یہ بات کی اور پروفیسر اسادا کو بذریعہ ای میل اطلاع دی کہ وہ الحمرا کے ہال نمبر دو میں تیرہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی بکنگ کے لیے رسمی درخواست براہ راست آرٹس کونسل کو بھجوا دیں تا کہ فائل کا پیٹ بھرا جا سکے۔

''ہیروشیما کی کہانی'' کی ڈرامائی تشکیل پیش کش میں سٹیج کرافٹ، ساؤنڈ اور لائٹنگ کے حوالے سے جدید ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے۔ پروفیسر اسادا نے بتایا کہ فی الوقت ان سب چیزوں کا انتظام ممکن نہیں تھا اس لیے ان کے طلبہ کا ایک حصہ ریڈیو ڈرامے کے انداز میں پیش کریں گے جس کا مقصد محض ہمیں اس کے موضوع اور انداز سے روشناس کرانا ہے۔ سو دس بارہ لڑکے اور لڑکیاں ایک لائن میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہمیں اس کھیل کا ابتدائی سین بول کر سنایا۔

بعض اداکاروں بلکہ صداکاروں کی اردو حیرت انگیز حد تک صاف تھی اور لہجہ بھی بہت عمدہ تھا البتہ بیشتر کے لہجے کا جاپانی پن چھپائے نہیں چھپ رہا تھا اور شاید یہی اس کی خوبصورتی بھی تھی مجھے یقین ہے کہ پاکستانی ناظرین اس کھیل کی روح سے متاثر اور اس کے انداز سے بے حد لطف اندوز ہوں گے۔

''ہیروشیما کی کہانی'' کے حوالے سے بات اردو ادب میں ''ہیروشیما'' کی استعاراتی پھیلاؤ اور اس کے گرد بنے گئے افسانوں اور نظموں کی طرف جا نکلی اور ہم کتنی دیر احمد ندیم قاسمی صاحب کے مشہور افسانے ''ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد'' پر بات کرتے

رہے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ جب اس دن کی روئیداد لکھی جا رہی ہو گی تو قاسمی صاحب کا ذکر حال کے منطقے سے نکل کر ماضی کے دھند لکے میں داخل ہو چکا ہوگا۔ اللہ اکبرٗ اللہ اکبر۔۔۔۔۔۔۔کل من علیہا فان!

اُلٹے قدم

۹ سے ۱۶ جون تک کے سفر جاپان کی روداد پھیلتے پھیلتے ''ساتواں در'' کے چودہ کالموں پر محیط ہو گئی ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ ''جناح'' کے قارئین نے نہ صرف اسے پسند کیا ہے بلکہ سیاسی مسائل سے بھرے سنجیدہ تبصروں پر مشتمل کالموں کی اس کہکشاں میں اسے ایک وکھری ٹائپ کا روشن اور پسندیدہ ستارہ قرار دیا ہے اور آئندہ کے لیے بھی فرمائش کی ہے کہ جب کسی سفر پر جائیں تو اس کی روداد ضرور لکھیں۔

تو بات ہو رہی تھی ٹوکیو یونیورسٹی برائے فارن سٹڈیز کے شعبہ اردو کے تیار کردہ ڈرامے ہیروشیما کی کہانی کی جو عنقریب کراچیٗ اسلام آباد اور لاہور میں بھی پیش کیا جائے گا۔ ڈرامے کے بعد تینوں مہمانوں کی گفتگو اور شاعری کا دور چلا اور اس کے بعد طلبہ کے سوالات کا ایک سیشن رکھا گیا۔ شاید یہ طلبہ کے پیش کردہ ڈرامے کا اثر تھا کہ زیادہ تر سوالات ڈرامے سے متعلق ہی کئے گئے اور تقریباً سبھی کا مجھے ہی جواب دینا پڑا۔ سوالات اگرچہ بنیادی نوعیت کے تھے مگر ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ محض سوال برائے سوال نہیں تھی۔

یونیورسٹی سے نکلے تو پھر وہی کھانے کا مسئلہ آ پڑا کہ اس علاقے میں نہ تو کوئی پاکستانی ریستوران تھا اور نہ ہی کسی میکڈونلڈ یا کے ایف سی کی خبر ملی جہاں سے کچھ ایسی چیزیں مل جاتیں جنھیں پورے نہ سہی تھوڑے بہت اطمینان سے نوش جان کیا جا سکتا اوپر سے بارش تھی کہ لگاتار ہوئے چلی جا رہی تھی۔ موبائل فون پر عامر کے بھائی یعنی عابد حسین سے مشورہ کیا گیا جو اس علاقے کو نسبتاً زیادہ جانتا تھا اور ہم سب اس کے بتائے ہوئے ایک ریستوران کی طرف چل پڑے جو اگرچہ فاصلے پر تھا مگر عابد کے بقول کھانے کے لیے کافی حد تک موزوں اور ''محفوظ'' تھا۔ خدا خدا کر کے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ لنچ کا وقت ختم ہو چکا ہے اور ڈنر کا کاروبار ابھی شروع نہیں ہوا۔ سو سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ قریب ہی ایک اور معقول صورت مگر خالص امریکی انداز کی جائے خورد و نوش تھی طے پایا کہ اسی سے کام چلایا جائے مینو کارڈ میں مختلف ڈشوں کی تصویریں بھی تھیں اور جاپانی اور انگریزی زبانوں میں ان کے اجزائے ترکیبی بھی درج تھے لیکن یہ سوال اپنی جگہ تھا کہ جس تیل میں انہیں تلا گیا ہے اس کا سلسلہ نسب کس کس جانور سے ملتا یا مل سکتا ہے۔

زبیر اور ملک حبیب کی احتیاط پسندی اور جاپانی زبان میں مہارت کا نتیجہ یہ نکلا کہ باورچی خانے سے شیف کو بلا کر تفصیل سے سمجھایا گیا کہ ہمارے اسلام کو خطرے سے نکالنے کے لیے اسے کن کن احتیاطی تدابیر سے کام لینا ہوگا اتنے میں عابد حسین اپنے دوست رمضان صدیق کے ساتھ پہنچ گیا جو ٹوکیو میں پاکستانی ہوٹلوں کی ایک چین کا مالک ہے اور خوردنی تیلوں کی اقسام کے بارے میں گہرا اور وسیع علم

رکھتا ہے۔ سواس نے ریستوران والوں کواپنی زبان میں اس طرح سمجھایا کہ سب کے خدشات دور ہو گئے۔

کھانے کے بعد اکیاہارا جانے کا پروگرام تھا جہاں الیکٹرانکس کی بہت بڑی مارکیٹ ہے اور جس کی منفرد خوبی یہ ہے کہ وہاں پاکستان میں استعمال ہونے والی وولٹیج کے مطابق اشیا ملتی ہیں ہم بظاہر اپنے ایچ کریم بخش نما جیسے نظر آنے والے ایک سٹور میں داخل ہوئے لیکن اندر پہنچ کر پتہ چلا کہ اس کے کوئی دس بارہ فلور ہیں اور ہر فلور پر الیکٹرونکس کی ایک ایسی دنیا آباد ہے کہ ہر شوروم پاؤں سے لپٹ لپٹ جاتا ہے۔

ایک شوکیس میں بلڈ پریشر ماپنے اور جانچنے کے بے شمار آلات رکھے تھے۔ عطا کو جو پسند آیا وہ کلائی پر گھڑی کی طرح باندھنے والا ایک آلہ تھا جو بیس سیکنڈ میں آپ کو بلڈ پریشر کے ساتھ ساتھ آپ کی ہارٹ بیٹ بھی بتا دیتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ ہدایت درج تھی کہ کلائی کو ایک مخصوص اور قدرے مشکل پوزیشن میں نہ رکھنے کی صورت میں اس کی ریڈنگ غلط بھی ہو سکتی ہے میں نے تین بار دکھائی گئی تصویر کے مطابق کلائی کو دل کے عین مقابل رکھ کر اپنا فشار خون ٹیسٹ کیا مگر ہر بار اتنا فرق نکلا کہ میں نے ملک ممتاز کے مشورے پر ایک نسبتاً آسان اور قدرے روایتی انداز کے آلے کو ترجیح دی جس کی ریڈنگ صحیح ہو یا نہ ہو تسلی بخش ضرور تھی۔

آڈیو سی ڈی پلیئر کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ چوتھے فلور پر جانا ہوگا وہاں پہنچے تو عقل دنگ رہ گئی کہ سی ڈی پلیئرز کی اتنی ورائٹی تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ ان میں سے ۹۹ فیصد نوجوان نسل کے شوق کے مطابق ڈیزائن کئے گئے تھے اور انہیں ہیڈ فون کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا اور جو ایک فیصد میری پسند کے تھے ان کا سائز خاصا بڑا تھا اچانک ملک ممتاز نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بہت کیوٹ سا سی ڈی پلیئر شاید ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا کیونکہ میں نے اسے پہلی نظر میں ہی او کے کر دیا۔ دوسری خوشی یہ ہوئی کہ اس کی قیمت بھی نہایت معقول تھی۔

بیگم صاحبہ نے فون پر جاپانی جیولری کی فرمائش کی تھی۔ عابد نے بتایا کہ سڑک کے دوسری طرف ایک متعلقہ سٹور ہے تو سہی لیکن اس بارش اور ٹریفک میں سڑک پار کرنا تھوڑی سی ہمت مانگتا ہے۔ میں نے اسے اکبر الہ آبادی کا ''لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے'' والا شعر کچھ وضاحتی مثالوں کے ساتھ سنایا تو اس نے فوراً مجھے اپنی چھتری کے سائے میں لے لیا۔ اور ہم دونوں بقول گلزار آدھا آدھا بھیگتے ہوئے سڑک پار کر گئے' لیکن ہماری یہ ساری دلاوری اکارت گئی کیونکہ وہ سٹور اب وہاں نہیں تھا اور اس کی جگہ ایک سر راہ ٹائپ چائے خانہ بن چکا تھا جو اس وقت ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔ کھانے کا انتظام رمضان نے اپنے ایک ریسٹورنٹ میں کیا تھا جو جدائی کے لمحوں کی مخصوص اداسی کے سائے میں کھایا گیا کہ کچھ دیر بعد ہم مہمانوں کو اپنے میزبانوں سے وداع ہونا تھا۔ امتیاز گوندل خاص طور پر تویاما سے اسی مقصد کے لیے آئے تھے اور ان سب کا ارادہ ہمیں ہمارے ہوٹل تک پہنچانے کا تھا مگر جب حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ائیر پورٹ یہاں سے ڈیڑھ

گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور اگر ہم اس تکلف میں پڑ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہمیں سونے کے لیے وقت نہ مل سکے گا بلکہ ہمارے یہ محبت والے میزبان بھی ساری رات سڑکیں ناپتے رہیں گے سو بڑی مشکلوں سے انہیں اس بات پر راضی کیا گیا کہ سب کی بھلائی یہیں سے جدا ہو جانے میں ہے۔ باہر نکلے تو بارش نیم تاریکی اور جلدی میں اس فیصلے پر عمل درآمد تو ہو گیا مگر دو تین دوستوں سے الوداعی مصافحہ اور معانقہ کہیں بیچ ہی میں رہ گیا۔

ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل کی بس ہمیں لے کر روانہ ہوئی تو اس وقت بھی بارش ہو رہی تھی۔ ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ محمود شام اپنے دوست عرفان صدیقی کے ہمراہ اس کے گھر چلے گئے تھے جہاں سے اگلے دن انہیں جاپانی حکومت کا مہمان بننا تھا اور اب پھر واپسی کے سفر میں عطا اور میں ہی رہ گئے تھے۔ اس بار ائیر پورٹ پر ہمیں ٹوکیو سے بنکاک اور بنکاک سے لاہور تک کے دونوں بورڈنگ کارڈ ایک ساتھ دے دیئے گئے سامان چونکہ لاہور تک بک ہو چکا تھا اس لیے اب ہمارے پاس تھوڑے تھوڑے دستی سامان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

بنکاک ائیر پورٹ اس بار اس قدر جانا پہچانا لگا کہ ہم بغیر کسی سے پوچھے سیدھے مساج پارلر میں پہنچ گئے اور تھائی لوگوں کے اس آرٹ سے خوب خوب لطف اندوز ہوئے کہ وہ مسافروں کی ساری تھکن اپنے ہنر مند ہاتھوں سے جیسے بدن سے کھینچ کر نکال دیتے ہیں۔ عطا کا خیال تھا کہ بقیہ چار گھنٹوں کے لیے وہیں کمرہ کرائے پر لے کر آرام کیا جائے مگر میں نے ائیر پورٹ پر گھومنے پھرنے کو ترجیح دی اور یوں ایک ڈیوٹی فری شاپ سے مجھے کچھ بہت اچھی کتابیں بھی خاصی معقول رعایت کے ساتھ مل گئیں جن میں سے ایک میں نے عطا کے خراٹوں کے باوجود لاہور پہنچنے سے پہلے ختم کر ڈالی۔

ائیر پورٹ پر برادرم مسعود چیمہ ہمارے انتظار میں کھڑے تھے انہوں نے ہماری روانگی کے دن ہی واپسی کا وقت اور فلائیٹ نمبر نوٹ کر لیے تھے۔ ایک بار دل پھر اللہ کی رحمتوں کے شکر سے بھر گیا کہ کس طرح وہ ہمیں ایسے بے شمار مہربانوں کی محبتوں سے نوازتا ہے جن سے بعض اوقات چند لمحوں سے زیادہ کی ملاقات بھی نہیں ہوتی۔ کسٹمز کے ڈیوٹی انچارج محسن رفیق نے بہت آؤ بھگت کی اور چند لمحوں بعد جب میں اپنی بیگم فردوس اور بیٹے ذیشان سے ملا تو یوں لگا جیسے یہ سارا سفر سات دن کا نہیں' سات منٹ کا تھا۔

◆◆◆

جس دیش میں گنگا بہتی ہے

کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری نوجوان نسل ہزاروں میل دور سمندر پار بسنے والی قوموں کے بارے میں جتنا کچھ جانتی ہے اس کا عشر عشیر بھی اسے چند میل کے فاصلے پر بسنے والے ان لوگوں میں بارے میں معلوم نہیں جن کے ساتھ ان کی مشترکہ تہذیب اور تاریخ کی داستان کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔غالب نے کہا تھا۔

گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اگر اس صورت حال کو آج پر منطبق کیا جائے تو اگرچہ پاکستان کا قیام ناگزیر تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بٹوارے سے پہلے ہم نے بہت سا وقت ایک ساتھ بھی گزارہ تھا اور اس سے کی اگر کچھ ناگواریاں تھیں تو کچھ خوشگوار احساسات بھی تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صحن اور باورچی خانے کی تقسیم کے بعد ہم لوگ زیادہ اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے کہ یہ تقسیم جھگڑا نہیں بلکہ جھگڑے کا حل تھی۔ مگر بدقسمتی سے ان باسٹھ برسوں میں دونوں ملکوں کے عوام نے فیصلے کا اختیار اپنے اپنے سیاست دانوں کو دے دیا اور وہ ہمیں ایک دوسرے سے دور کرتے چلے گئے۔فسادات میں جو کچھ ہوا وہ دیوانگی کے ایک فوری ردعمل کی داستان تھی یا یہ بارودی سرنگیں ہمارے اجتماعی ماضی کے راستوں میں پہلے سے دبی ہوئی تھیں۔اس پر ایک بے نتیجہ گفتگو آئندہ کسی صدیوں تک ہوسکتی ہے مگر ہمارے نزدیک اس کا ایک انتہائی اہم پہلو انگریز حکمرانوں کی ''Divide and Rule'' (تقسیم کرو اور حکومت کرو) کی پالیسی یقیناً تھی جس نے صدیوں پر محیط ایک جڑے ہوئے معاشرے کے منفی عناصر کو اتنی ہوا دی کہ ایک معقول سطح کا Intimate Relationship ایسا بگڑا کہ ہم لوگ اسے ایک Working Relationship کی شکل میں برقرار نہ رکھ سکے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

یہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے کہ دونوں طرف سے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ''سر کن کے پھٹ رہے ہیں'' کچھ ٹھیک سے نہیں کہا جاسکتا کہ پاک بھارت تعلقات (کم از کم عوام کی حد تک) میں یہ حالیہ گرم جوشی امریکہ کی تابعداری کا نتیجہ ہے۔میڈیا کی آزادی کی وجہ سے ایک دوسرے کے بارے میں معلومات کی فراوانی کے باعث ہے یا سچ مچ دونوں ملکوں کے

لیڈروں نے اس صورت حال کی روز افزوں سنگینی کا اندازہ کرلیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تینوں ہی عناصر اس تبدیلی کا باعث بنے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے کچھ ایسے اسباب بھی ہوں جو ابھی تک واضح اور روشن نہیں ہیں لیکن میرے نزدیک یہ ایک مستحسن صورت حال ہے جسے محاورتاً ''دیر آید درست آید'' بھی کہا جاسکتا ہے وہ لوگ جو اسے شک وشبے کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ خوشی منانے یا لڈیاں ڈالنے سے منع کر رہے ہیں انہیں بھی اس کا حق ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے اور ماضی کے بہت سے تجربات بھی ان کے حق میں جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے ایک سابقہ کھلاڑی ہونے کے ناتے سے یہی ہے کہ ہر بال کو اس کے میرٹ پر کھیلنا چاہیے سو ہمیں مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دینا چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ یہ منافقت سے پاک ہوگی۔

گزشتہ برس بھارت میں سات دن گزارنے کا تجربہ بہت خوشگوار تھا کہ حکومت اور عوام دونوں سطحوں پر محبت کے دعوے اور اظہار ہو رہا تھا۔ اس بار اگرچہ بھارت کی حکومت بدلی ہوئی تھی اور اس کی پاک بھارت پالیسی میں بھی وہ گرم جوشی نہیں رہی جو پہلے تھی لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کے باوجود عوام سے عوام کے رابطوں اور باہمی تعلقات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور بقول شخصے یہ وہ جن ہے جو بوتل سے باہر آ گیا ہے اور اب اسے واپس بوتل میں ڈالنا خود اس کے آقاؤں کے بس میں بھی نہیں رہا۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے دوست اور فلم' ادب اور موسیقی کی دنیا سے تعلق رکھنے والے پاکستانی احباب کے جانے پہچانے اور محبوب گلزار صاحب اپنی ادبی گرو اور بابا احمد ندیم قاسمی صاحب کی عیادت کے لیے پاکستان آئے تو ان کے ساتھ ایک زیر تکمیل پاکستانی میوزک البم کے کچھ ویڈیوز بنانے کی بات چلی جس کے پروڈیوسر برادر عزیز یونس چوہدری ہیں جو موسیقی کے عاشق اور دیوانے ہیں اور جو الیکٹرانک سازوں کے بے ہنگم شور' بے سرے گلوکاروں' بے سروپا شاعری اور راگوں کی بنیاد سے آزاد کمپوزیشنز کے اس طوفان میں ساز' آواز اور الفاظ کا ایک ایسا گلدستہ بنانے کے خواہاں ہیں جس کا ہر پھول اصلی اور خوشبودار ہو اور جس کی ساخت اور پرداخت نہ صرف اپنی مٹی میں ہو بلکہ اسے ''کیمیکلز'' سے بھی محفوظ رکھا جائے۔ میرے غریب خانے پر اس وقت تک تیار دو ریکارڈنگز انہیں سنوائی گئیں اور طے پایا کہ گفتگو کا اگلا سیشن ممبئی میں ہوگا جس میں مطلوبہ تفصیلات طے کی جائیں گی۔ ابھی ہم لوگ پروگرام بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ دہلی سے ساہتیہ اکیڈمی والوں کی دعوت آگئی کہ وہ ۱۸ تا ۲۰ مارچ ۲۰۰۵ء ''اردو کی نئی بستیاں'' کے زیر عنوان ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کر رہے ہیں اور مجھے اس کے ایک اجلاس کی صدارت کرنا ہوگی۔ اس دعوت نے نہ صرف یہ مسئلہ حل کر دیا بلکہ میری بیگم کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کا رستہ بھی نکل آیا کہ اسے انڈیا دیکھنے کا بہت شوق تھا سو اس کے لیے بھی دعوت نامہ منگوایا گیا تاکہ ویزے میں سہولت ہوسکے۔ وزارت خارجہ کے احباب برادرم اشرف قریشی اور سلیم عباس گیلانی کی محبت اور توجہ سے بھارتی سفارت خانے کے ویزا سیکشن کی پیدا کی ہوئی کچھ اڑچنیں بروقت دور ہوگئیں اور یوں ہمیں ایک مہینے کا دہلی' آگرہ' لکھنؤ اور ممبئی کے لیے پولیس رپورٹ سے مستثنٰی ویزا مل گیا۔

یونس صاحب اوران کے صاحبزادے عزیزی خرم کوان کے کسی سیاستدان دوست نے ویزا دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ سو طے پایا کہ ہم لوگ اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ۲۲ مارچ کو دہلی میں اکٹھے ہو جائیں گے۔

دوست احباب کو پیش کرنے کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحفے خریدنے نکلے تو ایک لطیفہ بہت یاد آیا' آپ بھی سن لیجئے۔

ایک صاحب پہلی بار کسی دوست کے گھر جا رہے تھے دوست نے بڑی تفصیل سے راستہ اور پتہ سمجھایا اور آخر میں کہا۔'' دروازے کی بیل دائیں ہاتھ پر لگی ہے اسے کہنی سے دبا دینا۔''

ان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔'' کہنی سے کیوں۔۔۔۔۔۔۔ہاتھ سے کیوں نہ بجاؤں گھنٹی؟''

'' وہ اس لیے کہ تمہارے دونوں ہاتھ تو تحفوں سے بھرے ہوں گے۔ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔''

لاہور ائیر پورٹ پر رضا علی عابدی کا متبسم چہرہ ہمارا منتظر تھا ان کی آواز کی طرح ان کی مسکراہٹ بھی بہت خوبصورت ہے۔ رسماً بھی مسکرائیں تو اچھا لگتا ہے اور اب تو برسوں کا تعلق بھی شامل حال تھا میں نے ان سے گلزار جاوید اور ناصر بغدادی کا اتہ پتہ پوچھا اور بولے۔ '' گلزار ابھی نہیں پہنچے اور ناصر بغدادی صاحب کو میں صورت سے پہچانتا نہیں ہوں' ہوسکتا ہے یہیں کہیں ہوں ویسے اب تو اصلی بغداد کی صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔'' کچھ دیر بعد ناصر بغدادی آئے تو گلزار نے ہم دونوں کے بالوں سے محروم سروں کی طرف غور سے دیکھا اور پھر میرے کان میں آہستہ سے بولا۔'' آپ دونوں تو ہم زلف نکلے۔''

لاہور سے دہلی تک پرواز کا دورانیہ صرف پچاس منٹ تھا۔ ٹیک آف اور لینڈنگ کے بیچ ایک سینڈوچ بھر وقفہ تھا جو چائے کی پیالی سے پہلے ختم ہو گیا۔ امیگریشن ہال میں پہنچے تو مجھے یاد آیا کہ پچھلی بار انہوں نے پاکستانی مسافروں سے الگ سے ایک فارم (جس کی تین کاپیاں تھیں) بھروایا تھا۔ بڑھتی ہوئی دوستی کے دعووں کے باوجود یہ ''خصوصی سلوک'' ابھی تک جاری تھا بس اتنا فرق پڑا کہ گلزار کے ایک عزیز نے جو ائیرپورٹ سے ہی متعلق تھا ایک کمرے میں بٹھا دیا اور امیگریشن کی ساری کارروائی وہیں پوری کرا دی۔ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ہدایت تھی کہ ہم ٹیکسی لے کر اپنی معینہ قیام گاہ یعنی انڈین انٹرنیشنل سنٹر پہنچ جائیں کرایہ وہاں ادا کر دیا جائے لیکن ہمیں وہاں پہنچانے کی ذمہ داری برادرم عازم گروندر کوہلی نے لے رکھی تھی جس سے ملتا جلتا چہرہ اس اس وقت کہیں دور دور تک دکھ نہیں رہا تھا۔

عازم کوہلی سے میری پہلی ملاقات دسمبر ۲۰۰۴ء تک ایک انتہائی دھندآلود رات کو ہوئی جب وہ اپنی بیگم اور بیٹی کے ساتھ ایک ایسی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آیا تھا جس سے متعلق رشتے کئی نسلوں تک پھیلے ہوئے تھے کہ اس کے میزبان محسن صاحب کی فیملی کے ساتھ اس کے بزرگوں کا دوستانہ بہت پرانا اور گہرا تھا جو قیام پاکستان یا بقول ان کے 'بٹوارے' کے بعد بھی جاری و ساری رہا اور دونوں خاندانوں کے افراد ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہے ہیں۔ اس واقعہ سے چند ماہ قبل ای میل پر عازم نے مجھ سے رابطہ کیا میں کمپیوٹر

کے حوالے سے ناخواندہ ہوں سو میری میل میرا بیٹا علی ذیشان دیکھتا ہے اور اپنی صوابدید کے مطابق پرنٹ نکال کر مجھے دے دیتا ہے۔ میں ہاتھ سے ان کے جواب لکھ دیتا ہوں جنہیں وہ متعلقہ احباب کو ای میل کر دیتا ہے اور یوں اس کمپیوٹر زدہ دنیا میں گزارے کی ایک شکل نکل آتی ہے۔ بوجوہ یہ ملاقات بہت مختصر تھی کہ چند گھنٹوں بعد عازم کو بذریعہ بس دہلی روانہ ہونا تھا اس وقت تک ابھی دونوں ملکوں کے درمیان پروازوں کا سلسلہ بحال نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس بیگم (ینیتا بھابی) بھارتی کرکٹر منندر سنگھ کی بہن ہیں اور خود عازم اردو پنجابی دونوں زبانوں میں صاحب کتاب شاعر ہیں۔ دہلی واپس جا کر اس نے اپنے سفری تاثرات پر مبنی ایک نظم مجھے بھجوائی جس کا عنوان تھا" کچھ دن ٹھہرو گے لاہورا!"

یہی نظم اصل میں ہماری دوستی کا نقطہ آغاز بنی کہ یہ ایک انتہائی خوبصورت، سادہ اور دل کو چھونے والی نظم تھی جو بیانیہ انداز کی ہوتے ہوئے بھی سیاسی بیانات سے کوسوں دور تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میرا ایک مشاعرے کے سلسلے میں بھارت جانا ہوا تو دلی میں میری میزبانی کا حق عازم نے ازخود حاصل کر لیا اور یوں اس سے دوستی اور مسلسل رابطے کا ایک ایسا سلسلہ بن گیا کہ اس بار اس نے ہمیں صرف کانفرنس کے تین دنوں کی حد تک ساہتیہ اکیڈمی کا مہمان بننے کی اجازت دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ ائیر پورٹ سے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر پہنچانے کے لیے وہ اور ینیتا بھابی آئیں گے تاکہ ان کی بھابی یعنی میری بیگم کو بھارت کی سرزمین پر باقاعدہ خوش آمدید اور "جی آیاں نوں" کہا جاسکے۔ یہ تفصیل تھی اس اجمال کی کہ ائیر پورٹ پر خلاف توقع وہ لوگ موجود نہیں تھے۔ گلزار جاوید کے عزیز کے موبائل سے انہیں کال کی تو پتہ چلا کہ وہ پون گھنٹے سے ہمارے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ گلزار کا بھتیجا پروٹوکول دینے کے جوش میں ہمیں ایک بغلی دروازے سے باہر لے آیا تھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ خیال آیا کہ شیخ سعدی نے کئی صدیاں قبل ایسی ہی کسی صورت حال میں کہا ہوگا۔

راہ راست بردا گرچہ دوراست

یعنی سیدھے راستے پر چلو چاہے وہ لمبا ہی کیوں نہ ہو۔

گزشتہ برس کی نسبت اس بار دہلی کی سڑکوں پر ٹریفک کی بدنظمی نسبتاً کم تھی۔ معلوم ہوا کہ زیر زمین ریلوے سسٹم کا ایک حصہ مکمل ہو کر کام کرنے لگا ہے سو سڑکوں سے ٹریفک کا کچھ لوڈ کم ہو گیا اور اس دوران میں کچھ فلائی اوورز بھی مکمل ہو گئے ہیں جس سے مزید سہولت ہو گئی ہے (اگرچہ بعد کے تجربات مختلف نکلے لیکن ان کا ذکر آگے آئے گا) انڈین انٹرنیشنل سنٹر کہنے کو ہمارے لاہور جم خانہ کی طرح کا ایک کلب ہے لیکن نہ تو وہاں ہماری طرح انگریز کی یادگار یعنی ٹائی لگا کر آنے کا کامپلیکس اور پابندی ہے اور نہ ہی اس کا ممبر بننے کے لیے بہت بھاری بنک اکاؤنٹ کی ضمانت درکار ہوتی ہے۔ یہ فنون لطیفہ سے کسی نہ کسی طرح متعلق لوگوں کا کلب ہے اور یہی اس کی اہلیت کی واحد شرط ہے۔

ان کے طور طریقے دیکھ کر ایک بار پھر احساس ہوا کہ ان لوگوں نے بعض عمدہ اصول وضع کر کے اور پھر ان پر قائم رہ کر کس طرح ایک ایسا نظام اقدار بنا لیا ہے جس کی بنیاد انسانیت اور ہنر مندی پر ہے۔ ہماری طرح انہوں نے جاگیر داری' کالا صاحب اور فوجی بوٹ کو سر پر چڑھانے کے بجائے انہیں ان کی جگہ پر رکھا ہے۔ سو اس کلب میں ہمیں یہ تینوں عناصر اور ان کے تازہ وارد ساتھی یعنی نو دولتیا کلاس والے بھی نظر نہیں آئے یا کم از کم ایسے لوگ نمایاں نہیں تھے۔ جس سے بھی بات کی اسے فنون لطیفہ کے کسی نہ کسی شعبے کی پہلی صف میں پایا۔ اکثر لطیفے اپنی بنیاد میں بڑے دردناک ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت یاد آ رہا ہے۔ آپ بھی اس زہر خند میں شامل ہو جایئے۔

سینئر شاعر شہزاد احمد راوی ہیں کہ ایک بار رائٹرز گلڈ کے الیکشن ہو رہے تھے' اس وقت کی برسر اقتدار پارٹی نے اپنا ووٹ بنک بڑھانے کے لیے اپنے من پسند آدمیوں اور غیر ادیب دوستوں کو بطور ادیب ممبر شپ دے دی اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے جب ان کے نام پڑھے تو حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کون سے ادیب اور شاعر ہیں' میں تو ان میں سے بیشتر ناموں سے بھی واقف نہیں۔ اس پر شہزاد احمد نے کہا۔

''آپ خاطر جمع رکھیے ان میں سے بھی اکثر آپ کا نام نہیں جانتے۔''

بات کسی اور طرف نکل گئی خیر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں کیونکہ وطن عزیز میں اکثر باتیں کسی اور طرف نکل جاتی ہیں۔ کمرہ نمبر ۶۰ میں سامان رکھا اور ساہتیہ اکیڈمی کے افسر مہمانداری سے آئندہ پروگرام کی تفصیلات حاصل کیں معلوم ہوا کہ بیشتر مندوب آ چکے ہیں اور کچھ رستے میں ہیں لیکن آج کی شام اور رات کا کوئی خاص طے شدہ پروگرام نہیں۔ ڈنر کا انتظام یہیں ہے باقی آپ جہاں چاہیں' آئیں جائیں۔ عازم اور بھابی کا اصرار تھا کہ آئندہ تین دن آپ نے ہمارے قابو نہیں آنا اس لیے اس وقت ہمارے ساتھ کھانا کھایئے۔ سو ایسا ہی کیا گیا۔ رات گیارہ بجے واپس پہنچے تو معلوم ہوا سوائے تقی عابدی کے سب لوگ آ چکے ہیں اور وہ بھی پہنچا چاہتے ہیں۔ عازم کوہلی نے ہمارے لیے پہلے سے ایک عدد موبائل فون کا انتظام کر رکھا تھا جو سارے قیام کے دوران ہمارے پاس رہا سو ہم نے مقامی محاورے کے مطابق کچھ ایسے احباب کو فون ''لگائے'' جنہیں فوری طور پر اطلاع دینا ''خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم'' کی ذیل میں آتا تھا صلاح الدین پرویز سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دو بہنوئی گزشتہ چند مہینوں میں انتقال کر گئے اور خود وہ بھی انجیو پلاسٹی وغیرہ کے عمل سے گزر چکا ہے۔ سو میں نے پہلے تو تعزیت کی اور پھر اسے حوصلہ دیا کہ عارضہ قلب فی زمانہ بیماری نہیں بلکہ سٹیٹس سمبل ہے۔

کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۱۸ مارچ صبح دس بجے ساہتیہ اکیڈمی کے ہال میں تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے پونے دس ہو گئے کہ بیرے اگر بہرے نہیں تو انہیں کوئی اور مسئلہ ضرور تھا کیونکہ روٹین کا ناشتہ (آملیٹ' فرائی انڈے وغیرہ) لانے میں بھی انہیں کم از کم پندرہ منٹ لگتے تھے۔ میں نے آلو کا پراٹھا منگوا لیا تھا سو اس کے دس منٹ اضافی سمجھ لیجیے۔ انڈوں کی تیاری کے سلسلے میں بیرے جس تفصیل سے ہدایت لیتے تھے اس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ اس سلسلے میں اندر جا کر مرغیوں سے خصوصی اجازت لیتے ہیں۔ انڈوں کے حوالے سے

انور مسعود کا سنایا ہوا ایک جملہ ہر روز ناشتے کی میز پر ایک نیا لطف دیتا تھا۔

بہو نے ناشتے کے لیے اپنے سسر سے پوچھا۔

''ابا جی! آپ کو انڈہ بنا دوں؟''

''نہ بیٹی تو مجھے بندہ ہی رہنے دے۔'' بزرگ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

ساہتیہ اکیڈمی والوں کی بھجوائی ہوئی گاڑیاں نو بجے سے مندوبین کو کانفرنس ہال میں پہنچا رہی تھیں اور ہمارا گروپ بالکل آخری تھا جس میں تقی عابدی بھی شامل تھے انہیں چونکہ اس اجلاس میں بولنا بھی تھا اس لیے وہ بار بار اپنے مخصوص حیدر آبادی تکلف کے ساتھ ساتھیوں کو تاخیر کا احساس دلا رہے تھے اس پر ایک دوست نے کہا' آپ ہمارے پاس ہوائی جہاز کے بورڈنگ کارڈ کی طرح ہیں کہ آپ کے بغیر جلسہ شروع نہیں ہو سکتا' سو خاطر جمع رکھئے۔ اس پر تقی عابدی کچھ بولے تو نہیں مگر انہوں نے ایک ایسی Look دی جو زبان حال سے کہ رہی تھی۔ ''حال اوئے ان پڑھو''

اگر چہ ہم لوگ پورے دس بجے منزل مقصود پر پہنچ گئے مگر یہ دیکھ کر خفت سی ہوئی کہ دیگر مہمانوں سمیت پاکستان کے ہائی کمشنر عزیز احمد خان بھی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ایک اچھے منتظم کی طرح بیک وقت چوکس اور Relaxed نظر آئے۔ عزیز احمد خان حسب معمول تپاک سے ملے۔ وہ ایک منجھے ہوئے سفارت کار ہیں بھارت جیسے مشکل ملک میں وہ جس خوش اسلوبی سے پاکستان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ ہم نے ہر ایک کے منہ سے ان کی تعریف سنی۔ گزشتہ دنوں انہوں نے جس طرح گلزار صاحب کو احمد ندیم قاسمی صاحب کی عیادت کے لیے انتہائی مختصر وقت میں ویزہ فراہم کیا اس سے یقیناً پاکستانی سفارت خانے کی نیک نامی میں اضافہ ہوا ہے وہ نہ صرف پہلے سیشن میں شامل ہوئے بلکہ آخر تک موجود رہے۔ کانفرنس ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیرون بھارت سے جتنے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا ان میں سے چند ایک ویزے کے مسائل' علالت یا دیگر وجوہ کی بنیاد پر آنے سے رہ گئے جو پہنچ پائے ان میں لاس اینجلس امریکہ سے نیر جہاں' ان کے شوہر زہانت صاحب' شاعر فرحت شہزاد' نیویارک سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد بمع بیگم' اردو ٹائمز والے خلیل الرحمٰن بمع بیگم اور برادرم وکیل انصاری جبکہ واشنگٹن سے ڈاکٹر عبداللہ' ٹورنٹو کینیڈا سے ڈاکٹر تقی عابدی' شکیلہ رفیق اور اطہر رضوی' ماریشش سے یاسمین بودی' برطانیہ سے عبدالغفار عزم' صابر ارشاد عثمانی' رضا علی عابدی اور پاکستان سے ہم تینوں یعنی گلزار جاوید' ناصر بغدادی اور یہ خاکسار آئے تھے۔ میری بیگم مندوب تو نہیں تھی پھر بھی اس نے کانفرنس کا بیشتر حصہ اٹینڈ کیا لیکن کچھ اس طرح کہ بقول ساغر صدیقی:

جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

غالباً ایسی ہی کیفیت کو فارسی میں ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' کہا جاتا ہے۔

کانفرنس کا آغاز سیکرٹری ساہتیہ اکیڈمی سچیدا نندن کے انگریزی خطبہ استقبالیہ سے ہوا جو ملیالم کے بڑے زبردست شاعر ہیں اور پچھلے دنوں ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ پاکستان بھی آئے تھے۔ یہ خطبہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا اسے ہونا چاہیے تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر نارنگ نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں خطبہ استقبالیہ کے بعض حصول کے اجمال کی تفصیل بیان کی اور مائیک نیر جہاں کی طرف بڑھایا جو جگت آپا ہیں اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی انہیں نیر آپا ہی کہہ کر بلاتے ہیں۔ انہوں نے برصغیر سے باہر اور خصوصاً امریکہ بلکہ لاس اینجلس میں اردو کی ترویج و ترقی اور مسائل کے حوالے سے کچھ باتیں کیں اور چلتے چلتے بغیر نام لیے ریحانہ قمر پر بھی ایک جملہ جڑ دیا جس کی ادبی منظر پر آمد نے کم از کم .L.A کی حد تک ان کے مقابلے میں ایک اور ادبی پلیٹ فارم ضرور پیدا کر دیا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی کی باری تھی۔ انہیں چونکہ اس کانفرنس کے بیشتر اجلاسوں میں بولنا تھا اس لیے یہاں انہوں نے ہاتھ ہولا رکھا اور صرف اس کانفرنس کی غرض و غایت اور اردو کی نئی بستیوں کی پیش آمدہ مسائل پر ہی گفتگو کی حاضرین میں سے جو لوگ فوری طور پر پہچانے جا سکے ان میں مشہور نقاد وارث علوی (جنہیں کچھ دوست بے تکلفی میں فسادی نقاد بھی کہتے ہیں) خواجہ حسن ثانی نظامی' ابوالکلام قاسمی' ش.ک. نظام' مناظر عاشق ہرگانوی' بلراج کومل' سیفی سرونجی' ڈاکٹر مظفر' اعجاز مجید صدیقی' عبدالمنان طرزی' عزیز پریہار' عنبر بہرائچی اور محمد زماں آزردہ شامل تھے۔ کچھ احباب سے بعد میں تعارف ہوا جن کا ذکر حسب موقع آگے آئے گا۔ قرۃ العین حیدر تو اب علالت کی وجہ سے گھر سے کم نکلتی ہیں مگر دہلی کے کچھ معتبر ادیبوں کو وہاں نہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ شمیم حنفی' عتیق احمد' شہپر رسول' شاہد مہدی' زبیر رضوی اور خاص طور پر صلاح الدین پرویز کی عدم موجودگی بہت کھٹکی۔ تصدیق کا موقع تو نہ مل سکا مگر سنا یہی گیا کہ وہاں بھی ہماری طرح گروپ بندیاں عروج پر ہیں اور اگرچہ نارنگ بہت صلح کل اور معاملہ فہم انسان ہیں مگر پھر بھی شاید بقول تاثیر "کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔"

حیدر آباد سے مجتبیٰ حسین کا فون آیا جو بائی پاس کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اب گھٹنے کے جوڑ کے ہاتھوں سخت پریشانی میں ہیں۔ گزشتہ تینوں سفروں کے دوران دہلی کے قیام میں ان کا بہت ساتھ رہا تھا سو اس بار ان کی کمی زیادہ محسوس ہو رہی تھی کچھ دیر بعد صلاح الدین پرویز سے رابطہ ہوا تو اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ بوجوہ جان بوجھ کر نہیں آیا تھا کہ ادھر بھی آبگینوں کو ٹھیس لگی ہوئی تھی۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ ہے کہ لوکل مسائل میں کبھی نہیں الجھنا چاہیے کہ یہ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کرنے والی بات ہے اور اس سے سوائے بدنامی اور پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا سو میں نے اس موضوع کو چھیڑے بغیر اس سے بات چیت کی۔ آج کل وہ لکھنے لکھانے کے علاوہ صرف سہ ماہی "استعارہ" نکالتا ہے اور غالب کے اس مصرعے پر عمل پیرا رہتا ہے کہ "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے"

شام کو اس کے اپارٹمنٹ میں کنٹر کے شاعر شوپرکاش اور آل انڈیا ریڈیو پر تنقید والے محمود ہاشمی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں حضرات بہت پڑھے لکھے اور عالمی ادب پر گہری نگاہ رکھنے والے ہیں۔ سو بات لاطینی امریکہ کہ فکشن اور فلسطینیوں کی شاعری کے درمیان گردش

کرتی رہی۔ اس دوران میں کچھ شعر وشاعری بھی ہوئی اور ایک بار پھر احساس ہوا کہ برصغیر کی علاقائی زبانوں میں کتنا زبردست ادب لکھا جا رہا ہے مگر ہم اپنے مقامی ادب کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہمارے بیوروکریٹ اردو کے ساتھ کرتے ہیں کہ بقول مشتاق احمد یوسفی:

''ہمارے بیوروکریٹ غلط انگریزی کو صحیح اردو پر ترجیح دیتے ہیں۔''

۱۹ مارچ کانفرنس کا دوسرا دن تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کانفرنسوں کے ابتدائی اجلاس کے بعد حاضری ایک دم کم ہو جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا نہ صرف گزشتہ روز کے سامعین اور مندوبین موجود تھے بلکہ کچھ نئے چہرے بھی نظر آئے۔ ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ افتتاحی اجلاس میں خواجہ حسن نظامی کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی بھی قدرے تاخیر سے شامل ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے تعلق کے باعث انہیں بھارتی مسلمانوں کا ایک اہم اور بااثر نمائندہ سمجھا جاتا ہے مگر شخصیت کے اعتبار سے بھی وہ ایک محبتی، ملنسار اور جہاں دیدہ انسان ہیں اور مذہبی پروگراموں سے بھی زیادہ زبان وادب کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں خوش طبع اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع النظر بھی ہیں سو عمومی طور پر ہر جگہ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے احمد مشتاق کی شاعری پر مقالہ پڑھنا تھا جسے میں یوں بھی سننا چاہتا تھا لیکن ان کی فرمائش کی وجہ سے مزید پابند ہو گیا جس کے نتیجے میں دو تین ایسے مقالے بھی سننے پڑے جو اس ریچھ کی طرح وفادار تھے جس نے مالک کی ناک سے مکھی اڑانے کے چکر میں اس کی ناک ہی اڑا دی تھی۔

احمد مشتاق گزشتہ کئی برس سے نقل وطن کر کے نیوجرسی امریکہ میں جا بسے ہیں یہاں بھی ان کا شمار اپنی نسل کے نمائندہ شاعروں اور پاک ٹی ہاؤس کے مستقل بیٹھنے والوں میں ہوتا تھا، قدرے ہکلا کر بات کرتے تھے جس کے باعث مشاعروں سے گریز کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے بیشتر اشعار اہل ذوق کو زبانی یاد تھے اور ہیں۔

جی بھر آیا کاغذ خالی کی صورت دیکھ کر
جن کو لکھنا تھا وہ سب باتیں زبانی ہو گئیں
رہ گیا مشتاق دل میں رنگ یاد رفتگاں
پھول مہنگے ہو گئے قبریں پرانی ہو گئیں

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

میں نے کہا کہ دیکھ یہ میں یہ ہوا یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

ابوالکلام قاسمی کا مقالہ ان کے وسیع مطالعے اور حسن ذوق کا مظہر تھا اور انہوں نے احمد مشتاق کے کچھ ایسے شعر بھی سنائے جو پرانے ہونے کے باوجود نئے اور تازہ لگے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو صرف بہت اچھے شاعروں میں ہی پائی جاتی ہے۔ سنا ہے اب وہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا تازہ کلام شمس الرحمٰن فاروقی کے ''شب خون'' میں نظر آجاتا ہے۔ ''شب خون'' کے ذکر سے یاد آیا کہ گزشتہ تقریباً چالیس برس سے یہ رسالہ اپنے مخصوص انداز' فاروقی صاحب کی مدبرانہ صلاحیتوں اور اپنی اشاعت میں پابندی کے باعث اردو دنیا میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج ہی اس کے تازہ شمارے میں مطبوعہ ایک اعلان سے پتہ چلا ہے کہ اس کا آئندہ شمارہ آخری شمارہ ہوگا کہ اپنے ایک سینئر ہم عصر ''افکار'' کی طرح اسے بھی بند کی جا رہا ہے۔ اگرچہ فاروقی صاحب نے اس اقدام کی وجوہات بیان نہیں کیں مگر یہ کسی سے ڈھکی چھپی بھی نہیں ہیں کہ اب سنجیدہ ادب سے دلچسپی رکھنے اور رسالہ خرید کر پڑھنے والے اس قدر کم ہوتے جا رہے ہیں کہ رسالے کو ایک ادبی مشن کے طور پر چلانا ممکن ہی نہیں رہا اور جہاں تک اشتہار دینے والوں کا تعلق ہے وہ بھارت میں ہوں یا پاکستان میں' ان کے نزدیک ادب ایک جزوقتی مشغلے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ بقول شخصے اب تو خود شاعر اور ادیب بھی رسالوں میں اپنی تحریر کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتے۔ میرے خیال میں اب ایک کانفرنس دونوں ملکوں میں اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ ادبی رسالوں کو کیسے زندہ رکھا جاسکتا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بیتا بھابی بھی فردوس کو سینما ہال میں ''بلیک'' فلم دکھانے لے گئیں کہ اس کی نہ صرف وہاں بہت دھوم تھی بلکہ کیبل کے بہت سے چینلز پر ہمارے یہاں بھی لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ بہتر ماحول اور بڑی سکرین پر اچھی فلم کا ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے جس کا تجربہ مجھے اگلے دن ہوا۔

انڈین سنٹر کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کا انتظار کرتے ہوئے میری نظر ایک شناسا چہرے پر پڑی جو کچھ یورپین لوگوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ چند لمحوں بعد نظریں ملیں تو چاروں طرف ایک خوبصورت دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ خالد حسن تھے۔ انگریزی صحافت کا ایک بڑا نام اور ایک عمدہ لکھاری جن سے ملاقاتیں یوں تو تیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں لیکن وہ سب کی سب رسمی' مختصر یا اتنی بھاگ دوڑ کے دوران تھیں کہ ان کا حاصل گوروں کے آداب کے مطابق موسم کے حال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ سو آج پہلی بار کچھ باہمی دلچسپی کے امور پر بات کرنے کا موقع ملا اس دوران میں وہ زیادہ عرصہ پاکستان سے باہر رہے تھے مگر مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ شعر و ادب اور ڈرامے کے بارے میں ان کی معلومات بہت مفصل' اپ ٹو ڈیٹ اور اعلیٰ درجے کی تھیں جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ آج کل میں اپنے ایک دوست

چوہدری یونس کے ساتھ ایک ایسے میوزک البم پر کام کر رہا ہوں جس کی تمام کمپوزیشنز فوک یا کلاسیکل بنیادوں پر استوار ہیں اور جن میں ایک بھی الیکٹرانک ساز استعمال نہیں کیا گیا تو وہ نہ صرف بہت خوش اور متاثر ہوئے بلکہ بہت دیر تک کرید کرید کر مجھ سے اس کی تفصیلات معلوم کرتے رہے۔ اس دوران میں جاوید جبار بھی آ گئے اگرچہ وہ دو بار وفاقی وزیر بھی رہے لیکن ان کا اصل تعارف اب بھی میڈیا ایڈورٹائزنگ اور سماجی بہبود کا شعبہ ہے۔ دونوں حضرات اپنے اپنے میدان کے ماہر بھی ہیں اور خوش گفتار بھی سو گفتگو کا موضوع ہر پانچ منٹ بعد تبدیل ہونے کے باوجود محفل ایسی جمی کہ لطف آ گیا اس دوران میں بہت سے لطیفے بھی درمیان سے گزرے جو سب سے مزے کا تھا وہ آپ کی نذر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے صدر عام طور پر معمولی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے ملک سے باہر کی دنیا کے بارے میں ان کی ذاتی معلومات اکثر اوقات عام امریکیوں کی طرح انتہائی ناقص ہوتی ہیں۔ سو ہوا یوں کہ جارج بش کا انتقال ہو گیا جب وہ اگلے جہان پہنچا تو داخلی دروازے پر سینٹ پیٹر نے اسے روکا اور پوچھا کہ تم کون ہو۔ بش بہت جز بز ہوا اور بولا کہ تم مجھے نہیں جانتے' میں امریکہ کا صدر ہوں جارج بش۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں دنیاوی درجے اور تعارف نہیں چلتے اور ہر آنے والے کو اپنی شناخت کروانی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ عرصے پہلے پکاسو آیا اس نے بتایا کہ وہ مصور ہے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے فن کے نمونے دکھائے سو اس نے ایک تصویر بنا کر دکھائی اور اسے داخلہ مل گیا۔ پھر آئن سٹائن آیا اس نے کہا میں سائنس دان ہوں اور میں نے دنیا کو اٹم کی تھیوری دی ہے۔ استفسار پر اس نے اپنی تھیوری کی وضاحت کی اور اس کی بات مان لی گئی۔ بش نے کہا باقی بات میں بعد میں سنوں گا پہلے یہ بتاؤ کہ پکاسو اور آئن سٹائن کون لوگ ہیں۔

سینٹ پیٹر نے چند لمحے سوچا اور پھر دروازہ کھول کر کہا' تم اندر جا سکتے ہو کیونکہ تمہاری معلومات سے ثابت ہو گیا ہے کہ تم واقعی امریکہ کے صدر ہو۔

۲۰ مارچ کانفرنس کا اختتامی دن تھا اور آخری اجلاس کی صدارت مجھے کرنا تھی۔ اس صدارت کا واحد فائدہ یہ تھا کہ میں وہ مقالہ لکھنے سے بچ گیا' وقت کی کمی کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔۔ جس کا خلاصہ کر کے سنانا پڑتا تھا جو بہر حال کوئی ایسا اچھا تجربہ نہیں تھا کہ اس سے بات کچھ آدھا تیتر آدھا بٹیر جیسی ہو جاتی تھی۔ ہم سے پہلا یعنی سیکنڈ لاسٹ اجلاس امریکہ میں اردو صحافت کے بارے میں تھا۔ پہلے مقرر اردو ٹائمز والے خلیل الرحمٰن تھے جو بظاہر ایک مرنجاں مرنج' خوش باش' دلچسپ اور موڈی سے آدمی ہیں لیکن جس طرح سے انہوں نے مسلسل محنت کے ذریعے سے اپنے آپ کو اور اردو ٹائمز کو مستحکم کیا ہے اس سے ان کی دور اندیشی' تنظیمی صلاحیت اور مستقل مزاجی بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ بیشتر قارئین کے لیے یہ بات شاید حیرت اور دلچسپی کا باعث ہو کہ امریکہ اور کینیڈا میں ایک دو مستثنیات سے قطع نظر اردو اخبار اور رسالے

مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ایشیائی ہوٹلوں اور سٹورز پر ان کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور سرمہ مفت نظر کی طرح ان کی کوئی قیمت نہیں بلکہ چشم خریدار پر کوئی احسان بھی نہیں ہوتا یہ اخبارات اور رسائل مقامی اشتہارات سے چلتے ہیں اور ان کے پڑھے جانے کی بنیادی وجہ اپنے وطن، زبان اور تہذیب سے دوری کا وہ احساس ہے جو غیر ملکوں میں اپنے کسی بھی ہم وطن کو دیکھ کر جاگ اٹھتا ہے کہ بقول شخصے آدمی وطن سے نکل جاتا ہے وطن آدمی کے اندر سے کبھی نہیں نکلتا۔

خلیل الرحمٰن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اردو ٹائمز کے ذریعے ایک مشغلے کو پیشے کی شکل دے دی اور اب یہ اخبار امریکہ کی چودہ ریاستوں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے اور کینیڈا کے بعد اب انگلستان بھی اس کی زلفوں کا اسیر ہونے والا ہے۔ عمومی طور پر ان اخبارات کے مالکان کا مقصد ادب اور صحافت کی خدمت کے بجائے محض صفحے بھرنا ہوتا ہے تاکہ اشتہاروں سے بچنے والی جگہ پر کی جا سکے اور دوسرے یوں کہ یار لوگ اسے اپنے ذاتی تعصبات اور پبلسٹی کا ذریعہ بنا کر اس کی سطح اس حد تک گرا دیتے ہیں کہ اخلاقیات کے تمام معیار ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اگر چہ اردو ٹائمز بھی توجہ اور مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے لیکن اس نے ایک قابل قبول اخلاقی معیار ضرور قائم کر رکھا ہے سو اس حوالے سے خلیل الرحمٰن کو اپنی صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر پتہ نہیں کیوں اس نے سارے شمالی امریکہ کے اخبارات کی طرف سے وضاحت کی ذمہ داری اٹھالی اور بڑے جذباتی انداز میں اس بات پر زور دیا کہ وہاں کی صحافت پر گالی گلوچ، کردار کشی اور گھٹیا زبان کا الزام سراسر غلط ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی وجہ تقی عابدی کی پہلے دن کی وہ گفتگو ہو جس میں اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا اور جسے غلطی سے خلیل الرحمٰن نے اردو ٹائمز پر تنقید سمجھ لیا۔ بہر حال صورت حال اس وقت بہت گھمبیر ہو گئی جب لاس اینجلس اور امریکیوں کی زبان میں ویسٹ کوٹ سے آئے ہوئے شاعر فرحت شہزاد نے مقامی اختلافات پر مبنی ایک انتہائی جذباتی تقریر کی جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ خلیل الرحمٰن کو پورے شمالی امریکہ کی وکالت کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور یہ کہ گڑ بڑ ہے ضرور مگر ان کی طرف نہیں ہے چونکہ یہ گرما گرمی اس کانفرنس میں پہلی بار پیدا ہوئی تھی اس لیے حاضرین کی دلچسپی میں ایک دم اضافہ ہو گیا مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے یعنی استغاثہ کے بغیر ہی وکیلان صفائی باہم دگر دست و گریبان ہو رہے تھے۔ سو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ موضوع کے بجائے فرحت شہزاد کی بغیر بازوؤں والی شرٹ پر تبصرے کرنے لگے کہ ان کے خیال میں یہ لباس شاید کسی اور تقریب کے لیے زیادہ موزوں تھا۔

ڈاکٹر نارنگ کے لیے بھی یہ صورت حال خاصی غیر متوقع تھی چنانچہ وہ قدرے دیر سے بحث میں شامل ہوئے مگر ان کی خوش گفتاری بھی فضا کی بلند آہنگی کو اعتدال پر نہ لا سکی اس پر مجھے شیکسپیر کا ایک کھیل ''Much a do for Nothing'' بہت یاد آیا۔

اس کے بعد ہمارے والا یعنی آخری سیشن تھا جس میں خلیجی ریاستوں میں اردو کی صورت حال پر گفتگو تو ہوئی مگر اختلافات کی کوئی خلیج پیدا نہ ہوسکی۔ بحرین کے بزرگ شاعر سعید قیس' دوبئی کے ٹی وی پروڈیوسر اور عالمی مشاعروں کے منتظم مرحوم سلیم جعفری اور عالمی ادبی ایوارڈ اور مشاعروں والی مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے ملک مصیب الرحمٰن اور محمد عتیق صاحبان کی خدمات کو سب نے سراہا کہ ان لوگوں نے اس صحرا کو ادبی حوالے سے نخلستان بنا دیا ہے۔

شاعرف س اعجاز کا تعلق کلکتہ سے ہے جہاں سے وہ ادبی رسالہ ''انشاء'' باقاعدگی سے نکالتے ہیں اور ''نقوش'' والے محمد طفیل کی طرح اتنے خاص نمبر نکالتے ہیں کہ عام شمارہ کبھی کبھی شائع ہوتا ہے۔ کانفرنس کے اختتامی جلسے کے بعد اسی ہال میں انشاء کے گوپی چند نارنگ نمبر کی تقریب اجراء تھی جس میں صاحب نمبر اور مدیر و مرتب دونوں کی خدمات کو خوب سراہا گیا۔ نظامت نور جہاں ثروت نے کی بہت سے احباب نے نثر میں اور کچھ شعراء نے نظم کی شکل میں اظہار خیال کیا ان میں مخمور سعیدی اور رفعت سروش جیسے معروف ناموں کے ساتھ ساتھ چندر بھان خیال اور متین امروہوی بھی شامل تھے۔ متین صاحب نے غالب کے ایک مصرعے کی تضمین کے حوالے سے جو نظم پڑھی اسے سن کر مجھے چند برس پہلے کشمیر ریسٹورنٹ نیویارک میں ہونے والی ایک تقریب بہت یاد آئی۔ ہوا یوں کہ برادرم خالد شاہین بٹ نے جو کیپٹن صاحب کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ میرے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا' خاصے لوگ جمع ہوئے جن میں ایک بہت طرح دار خاتون بھی تھیں۔

معلوم ہوا کہ ان کا تعلق حیدر آباد دکن کے کسی اہم سیاسی خاندان سے ہے۔ پی ایچ ڈی ہیں اور فرنچ اور انگریزی میں لکھتی ہیں وہ بالکل میرے سامنے کی نشست پر بیٹھی تھیں اور ایسی لگاوٹ اور توجہ کا مظاہرہ کر رہی تھیں جیسے ان سے برسوں کی دوستی ہو یہ صورت حال اس وقت اور زیادہ خطرناک ہو گئی جب انہوں نے سٹیج پر مجھے ایک چٹ بھجوائی جس میں درج تھا کہ میں نے آپ پر ابھی ابھی ایک نظم لکھی ہے اور پڑھنا چاہتی ہوں میں نے چٹ سٹیج سیکرٹری کی طرف بڑھا دی اور گھبرا کر نظریں جھکا لیں کہ اب ان خاتون کے ساتھ سارا مجمع بھی میری طرف دیکھ رہا تھا (کم از کم مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا) خیر کچھ دیر بعد انہیں سٹیج پر بلایا گیا وہ قیامت کے فتنے کے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھیں اور دلوں پر قدم رکھتی ہوئی مائیک پر آئیں اور بہت برطانوی تلفظ کے ساتھ ایک ایسی نظم پڑھی جس میں میرے لیے بہت اچھے اچھے لفظ استعمال کئے گئے تھے میں ابھی اس ماحول کے سحر میں گھرا ہوا تھا کہ کیپٹن شاہین بٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

''سر جی زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں یہ عورت اس سے پہلے یہی نظم چھ مختلف آدمیوں کے بارے میں پڑھ چکی ہے۔''

اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ متین امروہوی بھی اپنی یہی تضمین گزشتہ برس مجھے میرے لیے خاص طور پر لکھی گئی کہہ کر سنا چکے تھے لیکن

ان دو ایک سی باتوں میں جو فرق ہے وہ یقیناً اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

دہلی میں بہت سی آبادیاں ''باغ'' کے نام سے ہیں جن میں سب سے مشہور قرول باغ ہے۔ عازم گروندر سنگھ کو ہلی پنجاب باغ میں رہتا ہے اس نے مجھے بتایا کہ یہ آبادی تقسیم کے فوراً بعد بنی تھی اور اس میں زیادہ تر پنجاب کے شرنارتھی آباد ہیں۔ عازم کے دل کی طرح اس کا گھر بھی بڑا ہے اور وہ مہمان نوازی میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا مگر اس کے گھر میں داخل ہونا اور وہاں سے باہر نکلنا اپنی جگہ پر ایک امتحان ہے کہ اس نے ایک دو نہیں پورے چار کتے پال رکھے ہیں اور وہ بھی مختلف سائز اور نسلوں کے۔ سب سے بڑے کا نام رسکن اور چھوٹے والے کا بروٹس ہے۔ یہ نام سن کر مجھے اپنے ڈرامے ''وارث'' کا کتا کرسٹل یاد آ گیا کہ بقول چوہدری حشمت ''کتوں کے نام رکھنا تو کوئی انگریز سے سیکھے'' یوں تو میں نے آج تک کوئی بھی جانور نہیں پالا مگر کتوں سے تو مجھے باقاعدہ الجھن ہوتی ہے۔

کاٹتے رہتے ہیں اہل درد کو
اور کیا خدمت سگ دنیا کریں

یہ اور بات ہے کہ کتا کاٹے تو چودہ ٹیکوں سے ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن انسان کا کاٹا؟۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں ایک بڑھیا کو پاگل کتے نے کاٹ لیا' ڈاکٹر نے علاج شروع کیا۔ شام کو بڑا ڈاکٹر راؤنڈ پر آیا تو نرسوں نے بتایا کہ بڑھیا صبح سے مسلسل کچھ لکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا' یہ آپ کیا لکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ کوئی وصیت وغیرہ؟

''جی نہیں'' بڑھیا نے قلم روکے بغیر کہا۔ ''میں تو ان لوگوں کی فہرست بنا رہی ہوں جنہیں پاگل ہو جانے کی شکل میں' میں نے کاٹنا ہے۔''

عازم کے تین کتے تو گھر سے باہر رہتے ہیں سو انہیں تو باندھ یا پکڑ کر ہمارے داخلے کی صورت نکل آئی تھی مگر چھوٹے والا جس کا نام میں نے سپارکل چھوڑ رکھا ہوا تھا پورے گھر کی آنکھوں کا تارا تھا وہ طبیعتاً بہت مجلسی واقع ہوا ہے چنانچہ اپنے آقاؤں سے بڑھ کر حق میزبانی ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مہمانوں کو ایک پل تنہا نہیں چھوڑتا۔ حیرت ہے کہ فردوس جو عام طور پر کتوں سے بہت ڈرتی ہے بروٹس سے بہت جلد مانوس ہو گئی اور مجھے شیکسپیئر کی زبان میں کہنا پڑا کہ

Yet Brutas was an honourable dog.

خیر یہ تو ایک تفنن کی بات تھی کیونکہ اگر غور کیا جائے تو اس جانور کی عادت والے انسان آپ کو قدم قدم پر مل جائیں گے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے کاٹے کا کوئی علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ عازم کی بڑی بیٹی منیت عرف شینا (جس کا نام شیریں بھی ہے جو عازم کی بہن کا رکھا ہوا ہے جو ایران میں رہتی ہے) کا ذکر میں نے اپنے گزشتہ سفر کے احوال ''سات دن'' میں کیا تھا اس دوران میں اس کی

سگائی ہوگئی اور وہ اس برس ۲۴ دسمبر کو پیا گھر سدھار جائے گی۔ کسی نے کہا تھا کہ سکھوں کے بچے بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر پھر بڑے ہو جاتے ہیں لیکن شینا کا منگیتر بڑا ہو جانے کے باوجود بہت سمارٹ اور وجیہہ ہے البتہ اپنی دلہن کے پالتو بروٹس کے بارے میں اس کے خیالات سے آگاہی نہیں ہو سکی گا لباً وہ بھی یہی کہے گا کہ

I love thou, I love thy dog

خواتین کو شاپنگ کے لیے بھیج کر ہم دونوں فلم ''بلیک'' دیکھنے نکل گئے۔ اس کی وہاں بہت دھوم تھی۔ فلم ایک چھوٹے سینما گھر میں جنہیں ملٹی پلیکس کہا جاتا ہے لگی ہوئی تھی۔ سنا ہے اب پاکستان میں بھی اس طرح کے سینما گھر بن رہے ہیں کہ کسی بڑے شاپنگ مال میں دو ڈھائی سو سیٹوں والے کچھ ہال ساتھ ساتھ بنا دیئے جاتے ہیں جن میں مختلف فلمیں چلتی رہتی ہیں۔ سینما کا اندرونی ماحول بہت اچھا تھا۔ عمدہ سیٹیں شاندار سکرین اور بہترین ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ فلم دیکھنے کا ایک اپنا ہی لطف ہے اس سے قطع نظر کہ ڈائریکٹر اور رائٹر نے رانی مکھر جی کے کردار میں تنوع اور شدت پیدا کرنے کے لیے اسے بیک وقت' بہرا گونگا اور اندھا اور ذہنی طور پر غیر متوازن بنا دیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ فلمی لائسنس لیتے ہوئے امیتابھ بچن کو اندھے کے ساتھ ساتھ گونگے بہروں کی زبان میں باتیں کرتے دکھایا گیا تھا یعنی وہ ہاتھوں کے اشاروں اور آواز کے ذریعے رانی سے بات چیت کرتا تھا جبکہ وہ نہ دیکھ سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی لیکن اس مجبوری سے قطع نظر یہ ایک لاجواب فلم تھی۔ امیتابھ بچن اور رانی مکھر جی کی اداکاری تو توقع کے مطابق عمدہ تھی ہی مگر رانی کے بچپن کا کردار کرنے والی بچی نے کمال کر دیا۔ کہیں کہیں تو وہ امیتابھ بچن سے زیادہ سین پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں نئی اور اچھی بات کہنے کرنے کی گنجائش ہے جس کی وجہ سے تمام تر عریانی زدہ گلیمر کے باوجود چند ایک اچھی فلمیں ہر سال بن ہی جاتی ہیں۔ اس فلم کے ڈائریکٹر سنجے لیلا رام بھنسالی نے پچھلے برس ''دیوداس'' بنائی تھی جو ایک بہت مہنگی اور شاندار فلم تھی جس میں حقیقت اور Fantasy کو زبردست کمرشل انداز میں پیش کیا گیا تھا جبکہ ''بلیک'' بغیر کسی گانے اور گلیمر کے اپنی جگہ پر ایک موثر اور زبردست فلم ہے۔ اس فلم کو دیکھ کر ایک بار پھر خیال آیا کہ ہم ایسا کام کیوں نہیں کرتے۔

بھارت جا کر ''تاج محل'' نہ دیکھنا بڑی بدذوقی کی بات ہے (ویزا نہ ہو تو بات دوسری ہے) ۲۲ مارچ کا دن اس کے لیے پہلے سے طے تھا۔ سڑک بہتر حالت میں تھی اور ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ سو تقریباً چار گھنٹے میں ہم لوگ آگرہ پہنچ گئے۔ صوفیا کے مزاروں کی طرح ان تاریخی مقامات کا بھی ایک اپنا کلچر ہے کہ ان پر مختلف طرح کے مافیاز نے قبضہ کر رکھا ہے۔ مقامی فوٹو گرافروں اور انتظامیہ کی ملی بھگت سے سیاحوں کو موبائل کیمرہ اور مووی کیمرہ اندر لے جانے سے روکا جاتا ہے حالانکہ ان تینوں چیزوں کا تاج محل کی سکیورٹی سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ مقامی اور سیاحوں کے داخلہ ٹکٹ میں اتنا زیادہ فرق کیوں رکھا گیا ہے۔ یہ تو سیاحوں کا سراسر استحصال ہے کہ انہیں

میں روپے کی بجائے سات سو پچاس روپے فی کس کے حساب سے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس پر مجھے اپنے ایک بزرگ بہت یاد آئے' جو ۱۹۱۵ء میں حج کے لیے گئے تھے اور وہاں کے طویل قیام کے باعث تھوڑی بہت عربی بھی سیکھ گئے تھے۔ ایک دن سبزی فروش نے ان کو تاج محل کے ٹکٹ جیسے فرق کے ساتھ سبزی کا بھاؤ بتایا تو احتجاجاً ان کی عربی اور پنجابی کچھ اس طرح گھل مل گئی۔ ''یا شیخ! یا شیخ۔۔۔۔۔۔ انج ہی ہماری گچی گھٹ سٹو'' یعنی اس سے بہتر ہے کہ تم سیدھی طرح ہماری گردن دبا دو۔

''تاج محل'' کی خوبصورتی اور دبدبہ کچھ ایسا ہے کہ اس پر بات کرتے وقت عام طور پر خیال ہی نہیں آتا کہ یہ اصل میں ایک مقبرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اس کے متعلق ایسی ایسی رومانی اور انقلابی باتیں کرتے ہیں جن سے کم از کم ''قبر'' کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک شاعر فرماتے ہیں۔

یہ الگ بات کہ شرمندۂ تعمیر نہ ہوں
ورنہ ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

اور ساحر لدھیانوی کی وہ نظم تو کسی تعارف کی محتاج نہیں' جس میں وہ کہتا ہے۔

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

سو ان ملے جلے خیالات کے ہجوم میں جب ہم لوگ یعنی عازم کوہلی' جیتا کوہلی اور میں اور میری بیگم آگرہ پہنچے تو ماضی' حال اور مستقبل کچھ گڈ مڈ سے ہو گئے۔ ایک طرف اکبر کا مزار' آگرے کا قلعہ اور تاج محل تھے' دوسری طرف تیسری دنیا کے ایک پسماندہ اور غریب شہر کے در و بام اور تیسری طرف سائیکل رکشا میں بیٹھے ہوئے ایک آدم زاد کے ذہن کے کچھ اندیشہ ہائے دور و دراز!

تاج محل کو اگر عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے تو یہ کوئی بحث طلب بات نہیں کہ فن تعمیر کا ایسا شاہکار زمین کے تختے پر شاید ہی کوئی ہو اور اس کا حسن تناسب اور نقشہ کچھ ایسا ہے کہ انسانی عقل ورطہ حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ تین سو برس پہلے کے زمانے اور سہولیات کو ذہن میں رکھیں تو یقین نہیں آتا کہ ایسی عظیم عمارت کیسے سوچی اور تعمیر کی گئی۔ مغل فن تعمیر کی روایت کے مطابق اس کی حدود میں داخل ہونے کے لیے سنگ سرخ سے بنے ہوئے ایک بہت بڑے ڈیوڑھی نما دروازے سے گزرتے ہیں تو عین سامنے وہ جھروکا سا نظر آتا ہے جہاں ممتاز محل دفن ہے اور دل سے بے اختیار اس فنکار کے لیے داد نکلتی ہے جس نے اس کو جیومیٹریکل ڈرائنگ بنائی اور پھر اس تصور کو حقیقت کی شکل دی تھی۔ ابتدائی کارروائی کے طور پر ایک چالاک فوٹو گرافر سے تصویریں بنوائی گئیں جن کے پرنٹ ہمیں ایک گھنٹے میں تیار ملنے تھے۔ ''چالاک'' میں نے اس لیے کہا کہ فوٹو گرافروں کے ایک بہت بڑے ہجوم میں وہ ہمیں اپنی ہنرمندی کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ

ان میں ایک سے ایک چرب زبان پڑا تھا۔ موسم قدرے گرم تھا اور مسز کوہلی اپنے گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھنے سے گریزاں تھی۔ سو طے پایا کہ عازم ان کو کمپنی دے اور ہم دونوں میاں بیوی ساری عمارت کا راؤنڈ لگالیں۔ جو کوئی بہت مختصر بھی نہیں تھا مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے برس پہلی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بائیں ہاتھ کی طرف کچھ لوگ جوتوں کے غلاف لیے بیٹھے تھے جو جوتوں پر چڑھا دیئے جاتے تا کہ عمارت کا فرش صاف ستھرا رہے۔ میری نظر چوک گئی اور میں انہیں نہ دیکھ سا کا اور ہم نے باقی لوگوں کی طرح جوتے اتار کر دیوار کے ساتھ رکھ دیئے جہاں بلا مبالغہ سینکڑوں جوتے رکھے تھے۔ ایک بار جی میں آیا کہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کرنا چاہیے مگر مرکزی عمارت کو دیکھنے کی جلدی کچھ ایسی تھی کہ ہم نے اس طرف زیادہ توجہ نہ کی اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا لیکن اس کا ذکر مناسب وقت پر ہوگا' ابھی سے یہ بتانے کا کیا فائدہ کہ واپسی پر فردوس کے نئے اور پسندیدہ جوتے وہاں نہیں تھے۔

کتابوں اور گائیڈوں کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت صرف ''ایک قبر'' کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی اور شاہ جہاں نے اپنے لیے کچھ فاصلے پر جمنا کے دوسرے کنارے سنگ سیاہ سے ایک ایسا ہی مقبرہ بنوانے کا منصوبہ بنایا تھا جس کی بنیاد اس کے دور اقتدار میں ہی رکھ دی گئی تھی لیکن اس کے بیٹے اورنگزیب عالمگیر نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور باپ کو ماں کے پہلو میں ہی دفن کر دیا جس سے اس بے مثال عمارت کے جمالیاتی حسن کو یقیناً نقصان پہنچا کہ اس کا نقشہ صرف ایک قبر کو سنٹر کر کے بنایا گیا تھا لیکن جہاں خون کے رشتے بے معنی ہو جائیں وہاں جمالیات کی کون پروا کرتا ہے۔

مرکزی عمارت کی سطح زمین میں سے تقریباً اسی فٹ بلند رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف عمارت کے پیچھے کی کوئی چیز اس کے نظارے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ یہ ہر اعتبار سے مختلف منفرد اور علیحدہ بھی نظر آتی ہے اس کی چمک دمک' سنگ تراشی' جالیوں کی بناوٹ' ہنر مندی اور زیب زینت کے لیے بنائے گئے نقش ونگار اور عربی خطاطی کے کمالات ایسے ہیں کہ

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا' ایں جاست

جوتی چوری کے تجربے سے محظوظ ہونے کے بعد میں کچھ دیر کے لیے ایک گھاس کے قطعے پر لیٹ گیا اور زمان و مکاں کی اس شعبدہ گری میں پھر سے گم ہو گیا جو مجھے ہمیشہ مسحور رکھتی ہے۔ یہ تصور کہ ہم سے پہلے یہاں سے کیا کیا لوگ' کب کب گزرے تھے' ان ہواؤں میں ہم سے پہلے جن لوگوں نے سانس لیا تھا وہ ہمارے اندر کیسے در آتے ہیں' کیوں ہمیں کبھی نہ دیکھی ہوئی جگہیں مانوس لگتی ہیں اور گزرا وقت کیسے ہمیں پھر سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

نہ جانے کب تھا کہاں تھا' مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کہیں گزارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نہ جانے ہم ہیں دو بارا کہ یہ دو بارا ہے!

کچھ دیر بعد ایک فاسٹ فوڈ ریستوران میں ویجی ٹیبل پیزا کھاتے ہوئے دنیا پھر اپنی جگہ پر واپس آچکی تھی اپنی اپنی تھکن اور مجبوریاں پہنے ہوئے لوگ چاروں طرف آجا رہے تھے اور گفتگو اصل تاج محل کے جمال سے نکل کر اس موضوع کے گرد گھوم رہی تھی کہ سوونیئر کے طور پر بنائے جانے والے اس کے ماڈل کہاں سے بہتر اور سستے ملتے ہیں یہاں بیٹھے ہوئے مجھے گزشتہ سفر کا گائیڈ رائے زادہ اور شریک سفر ڈاکٹر تقی عابدی بھی بہت یاد آئے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ کہیں آس پاس ہی ہوں مگر کیلنڈر اور گھڑیاں کچھ اور ہی بتا رہی تھیں' ایک بے نام سی اداسی کے سائے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ میں وہاں موجود تو تھا مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ذات کا کچھ حصہ کہیں اور رہ گیا ہو۔ وہ علاقہ کون سا ہے؟ ماضی ہے یا مستقبل ۔۔۔۔۔۔۔ جو نسل در نسل اور زمانہ در زمانہ ہماری طرح اس کائنات میں محو سفر ہے یہاں آکر سارے علوم رک جاتے ہیں اور صرف غالب کا یہ مصرعہ گونجتا رہ جاتا ہے کہ

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ایک امریکن سیاح یورپ کے سفر پر نکلا تو قابل دید تاریخی مقامات کی ایک طویل فہرست اس کے ساتھ تھی جسے اس نے کچھ اس طرح سے بھگتایا کہ جب پیرس میں دریائے سین کے کنارے اس کے ٹورسٹ گائیڈ نے بس رکوائی اور اعلان کیا کہ اس وقت ہم مشہور تاریخی دریا سین کے کنارے پر کھڑے ہیں تو امریکی سیاح نے بس کی کھڑکی سے دریا پر ایک نظر ڈالی اور اپنی فہرست میں دریائے سین پر لکیر پھیرتے ہوئے کہا۔

Oh, it is river sane, ok, seen.

لیکن نہ تو ہم طبعاً امریکی سیاح تھے اور نہ تاج محل دریائے سین' سو ہم اس خوشگوار تجربے سے ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتن'' کی طرح گزرے۔ عازم کوہلی کے کسی دوست کے فارم ہاؤس پر ایک ڈنر تھا جس کی خاص بات راجستھان کی مخصوص گائیکی کے نمائندہ فنکار ''لانگا'' گروپ کی پرفارمنس تھی۔ میزبانوں نے ہم میاں بیوی کو بھی دعوت دی جو ہم نے اس لیے بلاتوقف قبول کر لی کہ اس کے ذریعے وہاں کے کلچر سے تعارف کے ساتھ ساتھ ''حسن سماعت'' کا موقع بھی نکل رہا تھا۔

فارم ہاؤس اپنے مکینوں کے تموّل اور حسن ذوق کا نمائندہ تھا۔ معلوم ہوا کہ اس دعوت میں ''ہولی'' کے استقبال کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ وسیع لان میں ایک طرف ماکولات اور دوسری طرف مشروبات کے سٹالز تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی خوش نما اور انتہائی ہنس مکھ خاتون ہر کام میں آگے آگے تھی۔

عازم نے بتایا کہ یہ جنرل جگجیت سنگھ اروڑی کی بیٹی ہے۔ ایک دم ذہن میں گھنٹی بجی اور سقوط ڈھاکہ مشرقی پاکستان، پلٹن میدان ڈھاکہ اور جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے مناظر نیون سائن کی طرح حافظے میں جلنے بجھنے لگے۔ کچھ لمحے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس اطلاع پر میرا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ عازم کو بلی میری ذہنی حالت سے بے خبر اس خاتون کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتا جا رہا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ کینسر کی مریضہ ہے اور اس کا مرض خاصی ایڈوانس سٹیج پر ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کو انتہائی خوش دلی اور بہادری سے جی رہی ہے اور یہاں بھی مہمان ہوتے ہوئے میزبانوں سے زیادہ سرگرم ہے۔ کچھ دیر بعد اس خاتون نے مائیک پر آ کر بڑی عمدہ انگریزی ملی اردو میں مہمانوں کا سواگت کیا اور راجستھانی موسیقی کے حوالے سے آج کے موسیقاروں کا تعارف کروایا یہ فنکار بڑے سیدھے سادھے اور نیم دیہاتی سی لوگ تھے۔

ان کے لیڈر محمد علی لانگا نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنے گروپ اور ان آئٹمز کا تعارف کروایا جو وہ پیش کرنے والے تھے اور پھر بڑی سادگی سے یکدم گانا شروع کر دیا۔ اکثر آئٹمز کو سننے کے دوران حافظے میں انڈین فلموں کے کچھ بہت عمدہ اور یادگار گانے یاد سے آ کر رہ جاتے تھے لیکن جب انہوں نے ''کیسریا بالما'' شروع کیا تو برادرم گلزار کی فلم ''لیکن'' جیسے سامنے چلنا شروع ہو گئی۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ راجستھانی موسیقی سے گلزار کو بے حد دلچسپی ہے اور وہ اکثر و بیشتر اس کی دھنوں کو اپنے گانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ محفل اپنے اختتام کے قریب تھی اور کھانا کھلنے ہی والا تھا کہ یکدم انہوں نے میرا لکھا ہوا ایک گیت ''لگن لاگی من کی لگن'' گانا شروع کر دیا، جو میں نے مرحوم نصرت فتح علی خان کے لیے لکھا تھا اور جو ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے راحت فتح علی خان نے نہ صرف ریکارڈ کرایا تھا بلکہ اسے مہیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ نے اپنی فلم ''پاپ'' میں بطور ٹائٹل سانگ بھی استعمال کیا تھا۔ میں اس خوشگوار اتفاق سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ عازم کے ذریعے انیتا اروڑہ اور پھر گانے والوں تک یہ اطلاع پہنچ گئی کہ اس گیت کے لکھیک اس محفل میں موجود ہیں۔ سو اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا اور گیت کو کئی بار سنا گیا۔ آخر میں فنکاروں نے آ کر اپنے مخصوص انداز میں میرے پاؤں چھوئے اور حاضرین نے کم و بیش فرداً فرداً مجھ سے تعریفی کلمات کہے۔ فن اور فنکاروں کی اس قدر افزائی سے بے اختیار ذہن اپنے معاشرے کی طرف گیا جہاں سرکاری طور پر موسیقی سے متعلق لوگوں کو اب بھی ''ارباب نشاط'' کہا جاتا ہے جس کا مہذب ترین انگریزی متبادل Entertainer ہے اور جہاں اصل اور رموز فن جاننے والے فنکاروں کو عزت تو کیا دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ بہت برس پہلے ایک بار میں نے برادرم خالد آفتاب کے گھر پر مشہور لوک گلوکار طفیل نیازی مرحوم سے انڈیا اور پاکستان کے ثقافتی رویوں کا فرق دریافت کیا تھا اور اس کا جملہ آج بھی مجھے اداس کر دیتا ہے۔ اس نے کہا تھا۔

''سرکار! اٹاری اور واہگہ کے درمیان صرف دو سو گز کا فاصلہ ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ اٹاری کے بارڈر پر لوگ ہمیں عظیم فنکار اور بھگوان کہہ کر

بلاتے ہیں اور واہگہ کراس کرتے ہی ہم میراثی اور بھانڈ بنا دیئے جاتے ہیں۔''

جس طرح ہمارے ہاں پی آئی اے کے ساتھ اب کچھ نجی کمپنیاں بھی ہوائی سروس کے شعبے میں کام کر رہی ہیں اس طرح انڈیا میں بھی سرکاری ایئر لائنز ''ایئر انڈیا'' اور ''انڈین ایئر لائن'' کی اجارہ داری ختم ہوگئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں پرائیویٹ ایئر لائنز تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہیں اور ان میں سے کئی ایک خاصی بڑی بلکہ بہت بڑی ہیں اور ان کا سسٹم بھی یورپ اور امریکہ جیسا ہے کہ مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ آئے دن نئے سے نئے پیکج نکالتی رہتی ہیں۔ ہمیں بھی جیٹ ایئر لائن کا ایک ایسا ہی پیکج مل گیا جس کے نتیجے میں سولہ سے اٹھارہ ہزار والی ٹکٹ دس ہزار میں مل گئی۔ پچھلی بار میں نے انڈین ایئر لائنز پر سفر کیا تھا جس کی یادیں کوئی زیادہ خوشگوار نہیں تھیں لیکن جیٹ ایئر لائنز کا جہاز اور عملہ دونوں بہتر تھے یہ اور بات ہے کہ بیگم کی موجودگی کے باعث عملے پر زیادہ توجہ دینا ممکن نہ تھا۔ ممبئی ایئر پورٹ پر سلیم عارف منتظر کھڑے تھے۔

گزشتہ بارہ برسوں میں ان کی شہرت عمر اور جسم تینوں بڑھے اور پھیلے ہیں۔ سو اب انہیں لڑکا کہنا تو قدرے مشکل ہے مگر ان کی مسکراہٹ کی اپنائیت اور گرم جوشی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ گاڑی میں سامان رکھوانے کے دوران انہوں نے بتایا کہ گلزار صاحب کو کسی روٹین میڈیکل چیک اپ کے لیے جانا تھا سو وہ ایئر پورٹ تو نہیں آسکے مگر اس وقت ہمارے ہوٹل میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں جو کہ ساحل پر واقع ہے اور اس کا نام بھی سی سائیڈ ہوٹل ہے جو ان کے گھر یعنی باندرہ سے کوئی بہت زیادہ دور نہیں۔

میری بیگم فردو کے ذہن میں انڈین فلموں اور فلم ایوارڈ شوز کے گلیمر کے باعث انڈین اداکاروں کے گھروں اور رہائشی علاقوں کے بارے میں تصور غالباً بہت مختلف تھا چنانچہ جب سلیم عارف نے ہمارے سمن آباد جیسی ایک آبادی میں واقع بڑے بڑے سٹارز کے گھروں کی نشاندہی کی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ امیتابھ بچن کے نئے اور پرانے دونوں گھر ہوٹل کے قریب ہی واقع تھے مگر ان کا بیرونی منظر بھی گزارے لائق تھا۔ البتہ یہ اطلاع اہم تھی کہ اس کا سکیورٹی کا عملہ خاصا بڑا ہے اور پولیس کی خصوصی گارڈ بھی چوبیس گھنٹے وہاں موجود رہتی ہے۔ ہوٹل کے چھوٹے سے استقبالیہ میں گلزار بھائی اپنی مخصوص خوشگوار اور بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھوں میں ایک خوبصورت گلدستہ لیے ہمارے منتظر تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اردو کا معانقہ کرنے کے بجائے پنجابی کا ''جپھا'' بلکہ جپھی ڈال کر ملتے ہیں۔ سو یہ خوبصورت رسم یہاں بھی نباہی گئی اور ان کے مشورے کے مطابق ہم پانچویں منزل پر واقع اپنے کمرے میں سامان رکھ کر فوراً ہی ان کے ساتھ چل پڑے کہ لنچ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ لنچ ایک ایسے چینی ہوٹل میں کیا گیا جو باہر سے 'ہوٹل تو کیا' کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا لیکن اندر سے نہ صرف بہت معقول تھا بلکہ اس کا کھانا بھی عمدہ اور خوش ذائقہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کھانوں کا بھی اصل چینی کھانوں سے اتنا ہی تعلق تھا جتنے ہمارے یہاں ہوتا ہے اس پر مجھے اپنے چینی شاعر دوست چانگ چی شوان عرف انتخاب عالم کا یہ جملہ بہت یاد آیا جو اس نے ہمارے لاہور کے میکانگ

ہوٹل میں ایک دعوت کے بعد کہا تھا۔

''مجھے نہیں پتہ تھا یہاں چینی ہوٹلوں میں پاکستانی کھانا بھی ملتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ کل ہولی کے تہوار کی وجہ سے شام چار بجے ہوٹل کے کمرے سے نکلنا ممکن نہ ہوگا سوسوائے ٹی وی پر پاک بھارت تیسرا ٹیسٹ میچ دیکھنے کے ہمارے پاس کوئی آپشن نہ ہوگا یعنی ہمارے پاس آج اور کل کی شام کے علاوہ صرف پرسوں کا دن ہے کیونکہ اس سے اگلے دن یعنی ۲۸ مارچ کی شام ہی ہماری واپسی کی فلائٹ بک ہے۔ ابھی ہم مہیا اور میسر وقت کی جمع تفریق میں مصروف تھے کہ اختر آزاد صاحب کا فون آگیا جو پہلے دن سے ہم سے رابطے میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لتا جی یعنی لتا منگیشکر اس وقت پونا میں ہیں اور ہماری واپسی سے قبل ان کا ممبئی پہنچنا مشکوک ہے کیونکہ آج کل اکثر بڑے فنکار ہولی کے دنوں میں شائقین کے ہجوم اور بے جا مداخلت سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں اور لتا جی تو ویسے بھی اب زیادہ وقت پونا میں ہی گزارتی ہیں۔ البتہ فون پر وہ ضرور رابطہ کریں گی کہ آئندہ ہفتے وہ میری ایک غزل اپنی نئی سی ڈی میں ریکارڈ کرانے والی ہیں۔ فردوس کو یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ امیتابھ بچن اور جیا بچن بھی اس حوالے سے گوا جا چکے ہیں اور پتہ نہیں کب واپس لوٹیں گے (کہ اس پروگرام میں ان لوگوں سے ملنا بھی شامل تھا) طے پایا کہ آج رات کو راج کپور کے مشہور پرتھوی تھیٹر میں ڈرامہ دیکھا جائے جو ہمارے ہوٹل سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع ہے کیونکہ اس کا غالب امکان ہے کہ آئندہ دو راتوں میں شاید اس کے لیے وقت ہی نہ نکل سکے۔ عدنان سمیع خان سے فون پر رابطہ ہوا اس کی آواز کی گرم جوشی اور محبت بھرے لفظوں سے اندازہ ہوا کہ بے پناہ شہرت اور کامیابی کے باوجود اس کا دماغ اپنی جگہ پر ہے اور وہ ایک اچھے اور خاندانی انسان کی طرح وضع داری اور تعلقات نبھانا اور رشتوں کی قدر کرنا جانتا ہے۔ اس نے کہا کہ کل سہ پہر اس کا ڈرائیور ہمیں ہمارے ہوٹل سے لے آئے گا اور پھر شام ہم مل کر گزاریں گے اور بہت ساری باتیں کریں گے۔

سٹیج پلے کا نام ''جنھے لاہور نہیں ویکھیا'' تھا۔ سلیم عارف نے بتایا کہ یہ چند برس پہلے لاہور کے کسی ڈرامہ فیسٹول میں بھی کھیلا جا چکا ہے۔ اس کے ہدایت کار فلم اور سٹیج کے سینئر اداکار ڈینش ٹھاکر ہیں اور اس کا پس منظر تقسیم ہند کے فوراً بعد پیدا ہونے والی صورت حال سے متعلق ہے جب برصغیر کے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ کھیل کا مرکزی کردار ایک بوڑھی ہندو عورت تھی جو ہنگاموں کے دوران پاکستان میں واقع اپنے گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے اور یہ گھر بھارت سے آئے ہوئے ایک مسلمان مہاجر خاندان کو الاٹ ہو جاتا ہے جو شروع میں اسے وہاں سے نکالنا چاہتے ہیں مگر پھر اسے بزرگوں جیسا سمجھنے لگتے ہیں۔ مفادات' فسادات' جہالت اور انتقام اور نیکی بدی کی ازلی کشمکش میں بالآخر فتح انسانیت کی ہوتی ہے۔ کھیل ہر اعتبار سے درمیانہ درجے کا تھا مگر تھیٹر کا ماحول اور پیش کش کا انداز بہت خوبصورت تھے۔

عدنان سمیع خان سے کوئی تین گھنٹے کی بہت پر لطف ملاقات رہی اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ اس وقت وہاں کا سپر سٹار ہے اور کامیابی کے جھنڈے گاڑتا ہی چلا جا رہا ہے اس کا وزن اگرچہ پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے لیکن چہرے کی معصومیت اور فن سے اس کی وابستگی ایسی غیر معمولی ہے کہ دھیان اس کے تن و توش کی طرف جاتا ہی نہیں۔ مرحوم نصرت فتح علی خان کی طرف اس کی انگلیاں بھی ساز کو چھیڑنے کے لیے بے چین رہتی ہیں سو اس محفل میں اس نے مجھے میری ایک غزل کی کمپوزیشن سنائی جو اس نے آٹھ برس قبل ایک بار لاہور میں مجھے گنگنا کر سنائی تھی۔ عدنان چونکہ بنیادی طور پر غزل کا سنگر نہیں ہے اس لیے اسے کچھ مسائل کا سامنا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے باہمی مشوروں اور ترمیم و اضافہ کے بعد جب دھن کی مطلوبہ صورت نکل آئی تو اس نے ایک بڑے مزے کی بات کہی' کہنے لگا۔ '' آٹھ برس سے یہ غزل میرے ذہن میں تیار تھی لیکن میں اسے ریکارڈ نہیں کر رہا تھا' اب میری سمجھ میں اس کی وجہ آئی ہے کہ دراصل یہ اپنی تکمیل کے لیے آج کی ملاقات کا انتظار کر رہی تھی۔''

جاوید صدیقی کا نام سٹیج ڈرامے اور فلم کے حوالے سے بہت معروف اور محترم ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اداکارہ راج ببر کی بیگم (جو مشہور ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کی صاحبزادی ہیں) نادرہ ببر' ان کا ایک سٹیج کھیل '' بیگم جان '' لاہور کے ایک ڈرامہ فیسٹول میں لے کر آئی تھیں جو مختلف حوالوں سے اخبارات میں شہ سرخیوں کا موضوع بھی بنا تھا۔ فلموں میں چونکہ چند بڑے سٹارز کے ناموں کے علاوہ باقی ٹائٹل اس تیزی سے گزارے جاتے ہیں جیسے کوئی ناگوار فرض پورا کیا جا رہا ہے اس لیے ممکن ہے پاکستانی ناظرین اس بات سے آگاہ نہ ہوں کہ ان کی چند بہت ہی پسندیدہ فلمیں جاوید صدیقی کی ہی لکھی ہوئی ہیں جو چند نام فوری طور پر یاد آ رہے ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔

دل والے دلہنیا لے جائیں گے ------ امراؤ جان ادا ------ ڈر ------- تہذیب ------ راجہ ہندوستانی ------ زبیدہ ------ جال ------ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی صاحبزادی عزیزہ لبنیٰ' سلیم عارف کی نصف بہتر ہیں اور ہندوستانی محاورے کے مطابق سارا خاندان فنون لطیفہ سے جڑا ہوا ہے۔ رات کا کھانا ان کی طرف تھا جہاں سعودی عرب سے آئی ہوئی ان کی بہن اور بھانجی بھی موجود تھے۔ سو گفتگو اپنی مرضی سے ٹریک بدلتی رہی اور صورت حال کچھ کچھ ایک فلمی گانے کے مکھڑے جیسی ہو گئی کہ

کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے
کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے

جاوید صدیقی ایک بہت محبت والے اور نفیس انسان ہیں اور ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو اپنی شہرت Deserve اور انجوائے تو کرتے ہیں مگر اس کی رو میں بہہ نہیں جاتے اور اپنا ہر کام پوری محنت اور دیانتداری سے کرتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے پروگرام بنا کر پرتھوی تھیٹر میں آج ڈینش ٹھاکر کے ایک کھیل '' ہائے میرا دل '' کا ہزارواں شو ہے سو یہ کھیل مل کر دیکھا جائے۔ ڈینش ٹھاکر کی فرمائش بھی

پوری ہوجائے گی اور ہم بھی یہ جان سکیں گے کہ بھارت میں ''مزاح'' کے نام پر کیا بلکہ کیا کیا ہو رہا ہے۔

پرتھوی تھیٹر کی کینٹین پر بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہاں ڈرامے کی روایت کتنی گہری اور مضبوط ہے۔ یہاں پرتھوی راج کی پوتی اور ششی کپور کی بیٹی سجنا کپور سے بھی ملاقات ہوئی جو آج کل اس تھیٹر کو چلا رہی ہے۔ فردوس نے بتایا کہ کچھ برس پہلے یہ کسی فلم میں ہیروئن بھی آئی تھی اس کے چہرے اور آنکھوں کے رنگ میں اس کی ماں جنیفر کی شباہت بہت نمایاں تھی۔ ڈرامہ سکرپٹ اور اداکاری کے اعتبار سے ٹھیک ٹھاک تھا مگر اہم اور زیادہ خوبصورت بات اس کی مختصر اختتامی تقریب تھی جو بیک وقت انتہائی سادہ اور پروقار تھی کہ پذیرائی کرنے اور کرانے والوں کی بنیادی اہلیت صرف اور صرف فن سے کمٹڈ ہونا تھا۔

اگلا دن جو ممبئی میں ہمارے اس دورے کا آخری دن تھا' گلزار صاحب کے نام تھا۔ سلیم عارف کے ساتھ ہم پالی ہلز باندرہ میں ان کے مکان ''بوسکینا'' پر پہنچے (گلزار کی بیٹی میگھنا کا پیار کا نام 'بوسکی' ہے اور اس کے نام بھی رکھا گیا ہے) تو وہ حسب معمول سفید براق کرتے پاجامے اور کھسے میں ملبوس ہمارے منتظر تھے۔ میں اس گھر میں دس بارہ سال پہلے بھی آ چکا تھا مگر ہر چیز نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ گلزار نے بتایا کہ اب انہوں نے اپنا دفتر بھی یہیں شفٹ کر لیا ہے جس کی وجہ سے اس علاقے کی Look تبدیل ہوگئی ہے۔ پتھروں اور درختوں سے ان کی دلچسپی ہر ہر چیز سے نمایاں تھی۔ کمرے میں سکھ' ہندو اور اسلام تینوں مذاہب کی نشانیاں ساتھ ساتھ تھیں بھگوان کی مورتی' کرپان اور چاروں ''قل'' مختلف دیواروں پر آویزاں تھے۔ سلیم عارف نے بتایا کہ ایک مرحوم دوست کی یاد کے حوالے سے گلزار ماہ رمضان میں باقاعدگی سے کچھ روزے بھی رکھتے ہیں۔

ایک طرف دیوار پر مختلف مشہور کارٹونسٹوں کے بنائے ہوئے گلزار کے کارٹون بھی آویزاں تھے جو ان کی تخلیقی اور جدت پسند طبیعت کے غماز تھے کہ عام طور پر لوگ اپنے کارٹون چھپا کر رکھا کرتے ہیں۔ گلوکار جگجیت سنگھ سے طے کیا تھا کہ وہ بھی گلزار کی طرف آ جائیں گے تاکہ اسی بہانے ملاقات کے ساتھ ساتھ مجوزہ سی ڈی کے لیے کلام کا انتخاب بھی کیا جا سکے ان کا فون آیا کہ وہ کچھ غیر متوقع مہمانوں کی وجہ سے پھنس گئے ہیں اور کوئی دو بجے تک پہنچ سکیں گے۔ دوسری طرف امیتابھ بچن کی سیکرٹری رابطے میں تھی کہ ان سے کب اور کہاں ملاقات ہو گی اور چونکہ مجوزہ وقت Clash کر رہا تھا اس لیے یہی طے پایا کہ جگجیت سنگھ' گلزار صاحب کے مشورے سے کلام کا انتخاب کر لیں گے اور بعد میں فون اور فیکس پر ''ایجاب وقبول'' ہو جائے گا۔

امیتابھ بچن گزشتہ تیس برس سے ہندوستانی فلم انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ چلے آ رہے ہیں۔ ان سے پہلے دلیپ کمار اور بعد میں شاہ رخ خان نے بھی اس میدان میں بہت نام کمایا اور اپنی اپنی جگہ پر یقیناً انہیں بھی بے مثال کہا جا سکتا ہے مگر شاید امیتابھ پر قسمت کچھ زیادہ مہربان ہے کہ بطور کریکٹر ایکٹر بھی وہ فلم کی باقی ساری کاسٹ پر بھاری پڑتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان سے ملاقات ساڑھے تین بجے فلم

''ضمانت'' کی لوکیشن پر ہوگی جس کی شوٹنگ گزشتہ بارہ برس سے رک رک کر ہو رہی ہے کہ فلم کے ہدایت کار وجے ناتھن اپنے پروڈیوسرز کی وجہ سے اسے مکمل نہیں کر پا رہے لیکن اس کے باوجود امیتابھ ان کے کام کو افضلیت دیتے ہیں کیونکہ وجے ناتھن نے ان کی گمنامی اور کشمکش کے دور میں انہیں ہیرو لیا تھا اور وہ یہ احسان بھول نہیں سکتے۔ گلزار نے بتایا کہ اس دولت زدہ انڈسٹری میں یہ غیر معمولی انسانی رویہ شاید امیتابھ کے والدین کی عمدہ تربیت کے باعث ہے اور خوش کن بات یہ ہے کہ یہ تربیت ان کے بچوں میں بھی منتقل ہو رہی ہے۔

امیتابھ شوٹنگ کی لوکیشن پر اپنی مخصوص لگژری کوچ استعمال کرتے ہیں (جس میں ان کا بیڈ روم، میک اپ روم اور باتھ روم وغیرہ خاص طور پر بنائے گئے ہیں) ہماری ملاقات یہیں ہوئی تا کہ آسانی اور یکسوئی سے بات چیت ہو سکے۔ پاکستانی ٹی وی اور فلم کے بارے میں ان کی معلومات بہت محدود ہیں اور اردو سکرپٹ بھی چونکہ وہ آسانی سے پڑھ نہیں سکتے سو پاکستانی شاعری کا بھی انہیں کوئی خاص پتہ نہیں تھا لیکن جس قدر محبت اور اخلاق سے ملے اور جس توجہ اور انہماک سے انہوں نے گفتگو میں حصہ لیا اس کا بیشتر کریڈٹ تو یقیناً گلزار ہی کو جاتا ہے کہ اصل میں وہ ہماری وساطت سے ان کی عزت کر رہے تھے جو ان کی خاندانی اور شخصی شرافت اور وضع داری کی آئینہ دار تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مخاطب کی بات کو غور سے سنتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے فن سے متعلق ہر اچھی یا نئی بات کو Pick کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ جب میں نے ان کی حالیہ فلم ''بلیک'' کے ایک سین میں ان کی ڈائیلاگ ڈلیوری کے ایک مخصوص پہلو کا ذکر کیا تو نہ صرف ان کی آنکھیں چمک اٹھیں بلکہ انہوں نے مختلف سوالات کر کے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کی اور دوبارہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ آپ اب تک ملنے والے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اتنی باریکی اور تفصیل سے یہ بات نوٹ کی ہے۔ اس پر گلزار کچھ اس محبت اور بے ساختگی سے مسکرائے جو صرف ان مخلص دوستوں کو ہی نصیب ہو سکتی ہے جو اپنے دوستوں کی عزت، تعریف اور ترقی پر خوش ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سلیم عارف نے اس موقع پر اپنے Digital کیمرے سے بہت سی تصویریں بنائیں۔ فردوس اس ملاقات سے بہت خوش اور Excited تھی جس پر بعد میں گلزار نے ہنسی ہنسی میں اسے خوب تنگ کیا۔

باہر نکلے تو انوپم کھیر سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے ہمیں اپنے موبائل پر آیا ہوا ایک ایس ایم ایس میسج دکھایا جو اس کے کسی پرستار نے ہولی کی مبارکباد کے سلسلے میں گلزار کے مخصوص سٹائل میں لکھا تھا۔ ہماری فلائیٹ کا وقت قریب آتا جا رہا تھا سو بات سلام دعا تک ہی محدود رہی۔ واپسی پر ہم نے جلدی جلدی بیٹے علی ذیشان اور کچھ احباب کے لیے گلزار کے ہمسائے میں واقع ایک سٹور سے کچھ مردانہ قمیضیں اور نواسیوں کے لیے کچھ کپڑے خریدے اور ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ گلزار کا اصرار تھا کہ وہ ہمارے چیک ان ہونے تک ہمارے ساتھ ہی رہیں گے حالانکہ میں نے انہیں کہا بھی کہ ہمارا فی الحال واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔ اسی طرح کی دلچسپ باتوں میں فلائٹ کا ٹائم ہو گیا۔ فلائٹ موسم کی خرابی کی وجہ سے خاصی ناہموار تھی چنانچہ دلی ائیر پورٹ پر اترتے وقت ہماری حالت کچھ ایسی تھی جیسے ہم آئے نہیں بلکہ

لائے گئے ہیں۔

اگلا دن عازم کوہلی کی فیملی کے ساتھ گڑگاؤں کی سیر میں اور شام انیتا اروڑہ کے گھر ایک نیم ادبی محفل میں گزری اور ایک بار پھر یہ تاثر پختہ ہوا کہ وہاں کے اہل ثروت میں زیادہ تعداد مہذب، تعلیم یافتہ اور سادگی پسند لوگوں کی ہے جو دولت سے زیادہ اپنی شخصیت کو وجہ اعزاز سمجھتے ہیں۔ دلی سے لاہور آتے ہوئے جہاز میں نوجوان کرکٹروں یاسر حمید، توفیق عمر اور خلیل احمد سے ملاقات ہوئی جو ون ڈے سیریز میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے واپس جا رہے تھے۔ ان نوجوانوں سے بات کر کے خوشی ہوئی کہ شوخ طبع اور کھلاڑی ہونے کے باوجود ان کی نشست و برخاست اور بات چیت کا انداز بہت سلجھا ہوا تھا، سو انہیں دیکھ کر احمد مشتاق کا یہ شعر بہت یاد آیا کہ

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے جب آئے تھے ویرانے میں

◆◆◆